عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیّہ کا

ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

دہلی

دورِ جدید

مرتّب		بدل اشتراک	
آخوندزادہ حسین امام		سالانہ	پانچ روپے 5/-
		ششماہی	تین روپے 3/-
جلد ۵ ، شمارہ (۴ و ۵)		فی پرچہ	آٹھ آنے 8/-

ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ ہجری مطابق اپریل و مئی ۱۹۴۲ء

فہرست مضامین

مضمون		صفحہ
بارہ ربیع الاول	ادارہ	۲ - ۸
اپریل ۱۹۳۰ء	ادارہ	۹ - ۲۴
قائدِ اعظم	ادارہ	۲۵ - ۲۸
فردوس بیک خوشۂ انگور فروشم	ادارہ	۲۹ - ۳۰
اسلام کا آخری رکن	جناب حضرت علامہ حافظ محمد اسلم صاحب	۳۱ - ۴۰
اپنی آنکھ اور سورج اور قرآن کریم کی روشنی	جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز	۴۱ - ۵۲
وعظِ جدید	جناب اسد ملتانی	۵۳
نقد و نظر	ادارہ	۵۴ - ۵۶
جمعیت العلماء	ادارہ	۵۷ - ۷۶
حقائق و عبر	ادارہ	۷۷ - ۸۲
الٰہ آباد	ادارہ	۸۳ - ۹۶
لمعات	ادارہ	۹۷ - ۱۱۶
ایک سوداگر کی نگہ دوررس		۹۴

دورِ حاضرہ کی عظیم الشان کتاب

معارف القرآن

(از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز مدظلہ)

یعنی حقائق قرآنی کا دائرۃ المعارف۔ جو اس اصول پر مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے مکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ قرآن کریم سے متعلق کوئی مسئلہ آپ کے ذہن میں آئے پوری کی پوری قرآنی تعلیم ایک دلکش مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔

جلد اوّل

شائع ہو چکی ہے۔ بڑی تقطیع $\frac{12 \times 29}{8}$ کے ۵۷۶ صفحات پر مشتمل۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد اعلیٰ درجہ کی

قیمت

بلا جلد	پانچ روپیہ 5/-	محصول ڈاک ۱۳ر
مجلد	ساڑھے چھ روپیہ	محصول ڈاک ۱۴ر

کتاب کا مقدمہ علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کے تبحرِ علمی کا آئینہ دار ہے جس میں علمِ تفسیر پر بالخصوص محققانہ بحث کی گئی ہے۔

ناظم

ادارۂ طلوعِ اسلام قرول باغ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزِ ملت ← لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ← مرکزِ ملت

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما

مرکزی فیصلوں کی اطاعت ہی ایمان ہے

یا ایھا الذین امنوا

اعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھام لو اور اس کی علیحدہ مت ہو

استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

بات اللہ اور رسول کی جب تمہیں اس بات کیطرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے

مرکز۔ مرکز کی اطاعت اور جماعت پیدا کرو

اس لئے کہ

جو جماعت سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا

جماعت کے بغیر اسلام کچھ نہیں!

علیکم بالجماعۃ فانما یاکل الذئب من الشاۃ القاصیۃ

(لسان رسول)

لا اسلام الا بالجماعۃ

(قول حضرت عمرؓ)

اقبال

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ — با ہزاران چشم بودن یک نگاہ

بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

۱۲ ربیع الاوّل

کوثر چکد از لبم بایں تشنہ لبی ! خاور دمد از شبم بایں تیرہ شبی
اے دوست ادب! کہ در حریم دل ماست شاہنشاہ انبیاء ۔ رسولِ عربی

حسن کے ذوقِ نمود نے انگڑائی لی۔ حظیرہ قدس کی ملکوتی فضا میں ہلکا سا تموج ہوا۔ ملاءِ اعلیٰ کے حریمِ ناز کے حریری پردوں میں غیر محسوس سی جنبش نظر آئی۔ بربطِ عدم کے خاموش تاروں میں نورانی ارتعاش سا محسوس ہوا۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں اوپر کو اٹھیں۔ سبوحٌ قدوسٌ کی بے صوت صدائیں، نور و نکہت کے رنگین ترشح کی صورت میں زمزمہ ریز و نغمہ بار ہوئیں۔ دور جانبِ عرشِ عظیم سے کُنْ کی جبروتی آواز نے اس طلسم سکوت کو توڑا۔ عدم کے پردے اٹھنے لگے اور افق سے اُس پار۔ عالمِ تصوّر سے نگار خانۂ کائنات نے خاموشی سے ابھرنا شروع کیا۔ سائنسدان نے اسے حرکت و حرارت سے تعبیر کیا۔ فلاسفر نے حلقۂ دامِ خیال قرار دیا۔ عشق نے جلوۂ یکتائے محبوب کہا۔ اربابِ قضا و قدر نے ایک متعین پروگرام کا نقطۂ اولیں بتایا۔ مذہب نے امرِ تکوین کا کرشمۂ حیرت زا نام رکھا۔ اور قلبِ سلیم نے مشیت ایزدی سمجھ کر سر جھکا دیا۔

ہیولائے کائنات ابھرنے کو تو ابھرا لیکن بڑا بے کیف اور بہت بے رنگ۔ آہستہ آہستہ اس کے بکھرے ہوئے ذرّوں میں ربط و ضبط پیدا ہونا شروع ہوا۔ ربط و ضبط سے اس خاکہ میں کچھ رنگینیوں کے آثار محسوس ہونے لگے۔ منتشر رنگینیوں نے آہستہ آہستہ متشکل ہونا شروع کیا۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بننے لگیں۔ جنت کی حوروں نے کنکھیوں سے باہم اشارے کیے۔ ناموسِ فطرت کی نگاہوں میں ہلکا سا تبسم پیدا ہوا۔ حریم قدس کے رازداروں نے کانوں ہی کانوں میں کچھ کہا سنا۔ زمین کانپی۔ آسمان تھرتھرایا۔ چاند کا ساغرِ زریں چھلک گیا۔ ستاروں کے ننھے ننھے دل ہل گئے۔ فضا میں ایک شور اٹھا اور

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور خودگرے۔ خودشکنے۔ خودنگرے پیدا شد

حوروں نے نغمۂ تبریک گایا۔ فرشتوں نے سر جھکایا۔ ارض و سموات نے اپنی باجگزاری کا خریطہ پیش کیا۔

ابلیس نے مقابلہ کا چیلنج دیا۔ اور یوں یہ عالمِ بے کیف۔ دنیائے رنگ و بُو اور جہانِ سوز و ساز بن گیا۔

ابلیسانہ سرکشی اور ملکوتی تسلیم و رضا کی یہی کشمکش تھی جو اس کی خودی کے استحکام اور اس کے جوھر انسانیت کے ارتقاء کا موجب بنی اب درحقیقت اس پروگرام کا پہلا درجہ شروع ہوا جس کے پیش نظر یہ تمام ابتدائی مراحل یوں طے ہوئے تھے۔ ابلیسانہ قوت کی تائید میں کشش و جاذبیت کے وہ تمام نگاہ فریب سامانِ رنگ و تعطر تھے جو اس نگارخانہ طلسم و حیرت کے دامن میں بھر کر رکھدئے گئے تھے اور اس کے خلاف اس پیکر خودی کی رشد و ہدایت کے لئے وہ پیغامِ ازلی جو مبداء فیض کی کرم گستری سے وقتاً فوقتاً اس کے پاس پہنچتا رہا۔ اس پیغام کی اِلم ایک تھی۔ حقیقت ایک تھی۔ لیکن جوں جوں اس طلسم خانۂ فسون و فریب کی جاذبیتیں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں۔ ان کے مقابلہ کے لئے اس اصول کی فروعات میں مناسب رد و بدل اور ضروری اضافہ ہوتا جاتا تھا تاکہ اس کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ جوہر انسانیت کا ارتقاء ہوتا رہے۔ یا ارتقائی مدارج تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ قافلہ سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان کا ہر قدم ایک خاص سمت اٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک نقطۂ آخریں کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ چنانچہ ان آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتہ۔ نشان بتا کر جاتا۔ تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ فوراً اس کے پیچھے ہولے اور راہ گم کردہ مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیران نہ پھرتا رہے۔ آج سے قریب ساڑھے تین ہزار برس اُدھر جب سینا کے مقدس میدانوں سے ایک عظیم المرتبت پیغامبر اپنا منصبِ جلیلہ ادا کر کے جانے لگا تو اہلِ قافلہ کو اسکی زبان سے سنا دیا گیا کہ

> "تیرا خدا۔ تیرے لئے۔ تیرے بھائیوں میں سے۔ تیرے مانند ایک نبی بھیجے گا۔ تو اس کو مانیو۔ میں اپنا کلام
> اس کے منہ میں ڈالوں گا" (توریت کتاب تجم۔ باب اٹھارہ)

شام و فلسطین کی وادیوں میں کوئی تین ہزار سال پیشتر حضرت داؤدؑ کے نغماتِ لاہوتی میں یہ صدائے ملکوتی بلند ہوئی کہ

> تیرا برگزیدہ بندہ جس کی طرف سے میرا جی راضی ہے پورب کی طرف سے اٹھے گا" (زبور)

اور ان کے پرشکوہ و صاحب سطوت جانشینؑ نے اس آنے والے کے نشانات بتا کر کہا کہ

> اے یورشلم کی بیٹیو! یہ ہے میرا دوست۔ میرا محبوب" (غزل الغزلات باب ۵)

پھر اسی یوروشلم میں آج سے قریب دو ہزار سال اُدھر ایک خدائی گڈریا نے اپنے گلہ کی منتشر بھیڑوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ میں اب جا رہا ہوں۔

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اب میرا جانا ہی اچھا ہے اس لئے کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو (دنیا کو) تسلی دینے والا تمہارے پاس نہیں آئے گا ..... جب وہ صداقت کی روح تمہارے پاس آئے گی تو وہ تمہیں سچائی کی طرف رہنمائی کرے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جو کچھ وہ سنے گا وہی کچھ کہے گا۔ اور وہ تمہیں آنے والی باتوں کی خبر دے گا" (یوحنا۔ باب ۱۶)

اور انجیل برنباس (فصل ۴۴) میں اس آنے والے کے متعلق ہے۔

وہ کیسا مبارک زمانہ ہے جس میں یہ رسول دنیا میں آئے گا۔ تم مجھے سچا جانو۔ ہر آئینہ میں نے اسے دیکھا اور اس کے سامنے عزت و حرمت کو پیش کیا ہے۔ جیسا کہ اس کو ہر ایک نبی نے دیکھا ہے کیونکہ اللہ ان (نبیوں) کو اس رسول کی روح بطور پیشگوئی کے عطا کرتا ہے۔ اور جب کہ میں نے اسے دیکھا میں تسلی سے بھر کر کہنے لگا اے محمدؐ اللہ تیرے ساتھ ہو اور مجھ کو اس قابل بنائے کہ میں تیری جوتی کا تسمہ کھولوں۔ کیونکہ اگر میں یہ شرف حاصل کروں تو بڑا نبی اور اللہ کا قدوس ہو جاؤں گا"

سرزمین ایران میں اسی طرح ایک جانے والے (جناب زرتشت) نے اپنے جانشین (جاماسپ) سے کہا کہ سن رکھو کہ

اولاد ہاشم میں ایک بزرگ پیدا ہوگا۔ دعوے نبوت کرے گا۔ اس کا مذہب سات ولایتوں میں جائے گا۔ اولاد نرینہ نہ ہے گی۔ البتہ لڑکی سے نام چلے گا۔ تاج کی جگہ سر پر عمامہ رکھے گا۔ آتشکدے اس کے حکم سے بند کر دئے جائیں گے"

ہندوستان کی سرزمین میں گوتم بدھ نے اپنے چیلے آنند سے جاتے وقت کہا کہ غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میرے بعد کئی بدھ آئیں گے۔ آخری بدھ کا نام تیریا (محمدؐ) اور لقب متیا (رحمت) ہوگا۔ گنگا کی وادیوں میں بسنے والوں کے نام بھی ان کی کتاب کلکی پوران میں ایک پیغام موجود ہے کہ

کلجگ میں سانبل دیپ میں جگت گرو پیدا ہونگے۔ باپ کا نام وشنو بھگت (عبداللہ) اور ماں کا نام سومتی (آمنہ) ہوگا۔ تاریخ پیدائش ۱۲ ربیع الاول۔ پیر کا دن۔ دو گھڑی دن چڑھے۔ پہلے باپ کا انتقال ہوگا پھر ماں کا۔ جگت گرو سانبل دیپ کی رانی سے شادی کریں گے۔ ایک پہاڑ کی کھوہ میں تپسیا کریں گے۔ پرش رام (روح اللہ) سے تعلیم پائیں گے بستی میں آکر تبلیغ کریں گے تو لوگ تکلیف دیں گے اور جگت گرو شمالی پہاڑوں کی طرف ہجرت کر جائیں گے۔ وہاں سے تلوار لیکر

پھر اس بستی کو آئیں گے۔ ملک فتح ہو جائے گا۔ جگت گرو کا ایک گھوڑا ہوگا۔ برق سے زیادہ تیز چلے گا۔ اس پر سوار ہو کر آپ کل زمین اور سات آسمانوں کی سیر کریں گے۔"

یہ وہ نشانات راہ ہیں جو ان بچے کھچے آثار قدیمہ میں ملتے ہیں جو آج کھنڈرات کی شکل میں یہاں وہاں پائے جاتے ہیں اور جن میں حوادث زمانہ نے معلوم کیا کیا تغیرات پیدا کر دئے ہیں۔ اگر یہ یادگاریں آج کہیں اپنی اصلی شکل میں موجود ہوتیں تو خدا جانے ان میں اس جلیل المرتبت آنے والے کے متعلق کن کن درخشندہ اور نکھرے ہوئے الفاظ میں کیسے آویزاں نظر آتے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کوئی سلسلہ کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتاب فطرت کے مختلف اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب کتاب کے آخری باب کی گویا تمہید تھی۔ یہ سب ایک ہی شجر طیّب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گل ہر سبد کے لئے نوید بہار تھیں۔ پھر جب مشیتِ ایزدی کی یہ محکم تدبیر جس کے لئے زمین اور آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے۔ اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت جس کے لئے کائنات کے ایک ایک ذرہ کو لاکھوں چکر دئے گئے تھے۔ گہوارۂ طفولیت سے نکل کر حریم شباب میں پہنچی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی روشنی میں کوثر و سلسبیل سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی آگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درون پردہ کے معدنِ لعل و گہر کو سموے۔ تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کی کھیل پتی سے بطحا کی وادیوں کی تزئین و آرائش کریں۔ صحن گلستانِ کائنات پر بہار آئی۔ چاروں طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا۔ ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم آنکھوں میں انی اعلم ما لا تعلمون کی تفسیر ایک پیکرِ محبوبیت بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرے چمکے۔ بلد الامین[1] کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کے لئے جبل تین پر حضرت نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا۔ جسے کوہِ زیتون پر جناب مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجۂ تسکین خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی خبریں وادیٔ طورِ سینین میں اسرائیلیوں کو دی گئیں

---

[1] والتین والزیتون وطور سینین وھٰذا البلد الامین

اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرتِ خلیل اکبر اور ذبیح اعظم علیہما السلام نے اپنے خدا کے حضور میں دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں۔ آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حد دد فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ طائر اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اٹھے فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوسِ گوش صداؤں سے گونج اٹھی۔ اور شجر و حجر پکار اٹھے کہ

اللّٰھم صلّ علیٰ نبینا محمدًا و بارک وسلم

یہ آنے والا (صلعم) رسولٌ کافۃً للنّاس اور رحمۃ للعٰلمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جس نے نوعِ انسانی کی تمام زنجیروں کو کاٹ کر اس رشتہ بپا طائرِ لاہوتی کو آسمان کی فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی عطا کر دیا۔ لیکن افسوس کہ انسانوں نے اپنے اس محسنِ اعظم کی صحیح منزلت کو نہ پہچانا۔ ان شوریدہ بخت شپرہ چشموں کو چھوڑیئے جنھوں نے اس نورِ مبین کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ انھیں لیجئے جنھوں نے دنیا کے سامنے حضورؐ کی عظمت کا اعتراف کیا تو اس انداز کا کہ کسی نے "عرب کا ہیرو" قرار دیا۔ کوئی آگے بڑھا تو اس نے اس آفتابِ جہانتاب (یا اس سراجاً منیرا) کو صرف "مسلمانوں کی قوم" کے صحنِ خانہ کا چراغ سمجھا۔ کسی نے یہ نہ جانا کہ سورج کسی خاص چار دیواری میں بسنے والوں کے لئے وجہِ روشنی نہیں ہوتا بلکہ ہر اس شخص کے لئے چشمۂ نور ہوتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر اس سے مستنیر ہونا چاہے۔ چھوٹے چھوٹے دیئے اپنے اپنے گھروں کے دیئے ہوتے ہیں لیکن مہرِ عالمتاب ساری دنیا کا مشترکہ سورج ہوتا ہے۔ حضرت عیسٰیؑ و موسٰیؑ کے ماننے والوں اور جناب بدھ اور کرشن کے بھگتوں کو (حضور سرورِ کائنات) محمدؐ رسول اللہ کی ضیا پاشیوں سے آنکھیں نہیں بند کر لینی چاہیئے تھیں کہ محمدؐ کا لایا ہوا پیغام کوئی انوکھا پیغام اور ان کی دی ہوئی تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی۔ وہ اس کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی، وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کے تصدق تھی جن کے مجموعے کا گلدستہ حضور خاتم النبیینؐ کے دستِ اقدس سے محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ انہی مقدس اوراق کی شیرازہ بندی ہے جنھیں آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں ادھر ادھر بکھیر دیا تھا۔ ان کی از سرِ نو شیرازہ بندی اور قیامت تک کے لئے اقتضاآتِ زمانہ کے مطابق تکملہ کہیئے کہ اس سے انکار کی کیا وجہ

اور اعتراض کا کیا باعث؟ لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ جب جناب گوتم کا دل ایک اپاہج کو دیکھ کر تڑپ رہا تھا اور حضرت مسیح کوڑھیوں کی تکلیف کے احساس سے نم چشم تھے تو وہ بھی در حقیقت مقام محمدی ہی کے آئینہ جمال کا پرتو تھا اور جب حضرت موسیٰ اپنی غلام قوم کو فرعون کے استبداد سے نجات دلانے کے لئے مصروف پیکار تھے اور حضرت یوسفؑ اپنے قید خانہ کے رفیقوں کو متعدد آقاؤں کی غلامی سے نکل کر ایک خدائے قہار کی محکومیت کا وعظ ارشاد فرما رہے تھے ....

تو اس وقت بھی مقام محمدی ہی کے آفتاب جلال کی جلوہ افگنی تھی۔ جب زرتشت اپنے جانشین جاماسپ کو بقائے دوام حاصل کرنے کے لئے سوز نفس کے رازوں سے آگاہ کر رہے تھے اور حضرت خلیل اکبر عشق کی راہ میں اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ رہے تھے۔ تو وہ بھی اسی مقام محمود کی ضیار پاشیاں تھیں۔ غرضیکہ جہاں جہاں کوئی اصلی حقیقت تھی تو وہ قرآن ہی کے کسی نہ کسی صفحہ کی کوئی سطر تھی اور جہاں جہاں ان حقائق کے علمبردار حضرات کے اعمال زندگی تھے وہ حامل قرآن کی سیرت مقدسہ کے کسی نہ کسی پہلو کے آئینہ دار تھے۔

هر کجا بینی جهانِ رنگ و بو | آنکه از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بهاست | یا هنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے اور یہاں یہ پیکر جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرع میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا اور جو مصرعۂ ثانیہ کا محتاج نہ تھا۔ وہ موتی تھے یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھا۔ وہ افراد تھے یہ ملت تھا۔ وہ نقطے تھے یہ خط مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمینی انتہاست!

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت ابھی ان بلندیوں تک پہنچی ہی نہیں جہاں وہ مقام محمدی کی ماہیت سے آگاہ ہو سکے ایک طرف اس ذات اقدس و اعظم (فداہ ابی و امی) کی عظمت اور حضورؐ کی وساطت سے ملے ہوئے پیغام کی رفعت کو دیکھئے تو تصور سر بگریباں ہو جائے۔ زرا اندازہ فرمائیے کہ مصور کائنات نے بلندیوں اور پستیوں کے کتنے چکر دیئے کہ اس کے بعد یہ حسین و جمیل شاہکار وجود میں آیا۔ مصنف صحیفۂ فطرت نے کس قدر

نادر مضامین کی تسوید و تسبیض کی جو یہ آخری پیغام متشکل ہوا ۔ دوسری طرف اس پیغامِ حیات پرور کی عالمگیر وسعتوں پر نگاہ ڈالئے تو تخیل انگشت بدنداں رہ جائے۔ کسی ایک خطہ ۔ ایک ملک ۔ ایک برِ اعظم ۔ ایک فرقہ ایک جماعت ۔ ایک قوم کی راہ نمائی کے لئے نہیں بلکہ تمام کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کے لئے ضابطۂ حیات اور پھر کسی خاص وقت ۔ خاص ماحول ۔ خاص زمانہ کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک کے لئے نصاب زندگی کیسا ناپیداکنار ظرف تھا اُس قلبِ منوّر کا جو ایسے ' زمان و مکان کی حدود سے بلند و بالا پیغام کا مہبط قرار پایا ۔ اور علم صحیح کے کس افق اعلیٰ پر مقام تھا اس معلم الحکما ، ذات گرامی کا جس کا ادراک گنجینۂ حقائق کائنات ٹھہرا انسانوں نے اس آفتاب علم و حقیقت سے اعراض برت کر دیکھ لیا ۔ یہ جہنم اور اس کے آسمان رس شعلے سب اس انکار وجود کا نتیجہ ہیں ۔ ان مصائب و نوائب اور اس کرب و الم سے نجات کا طریقہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان مقام محمدیؐ سے آگہی پیدا کرے اور پیامِ محمدؐ کو زندگی کا نصب العین بنائے اور اُس بارگاہ عالیہ پر جا کر جھکی ہوئی نگاہوں اور لرزتے ہوئے قلب سے اعتراف کرے کہ

نہ جہاں میں مجھ کو اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی !
میرے جرم ہائے سیاہ کو تیرے عفو ۔ بندہ نواز میں

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذرہائے من پذیر
اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

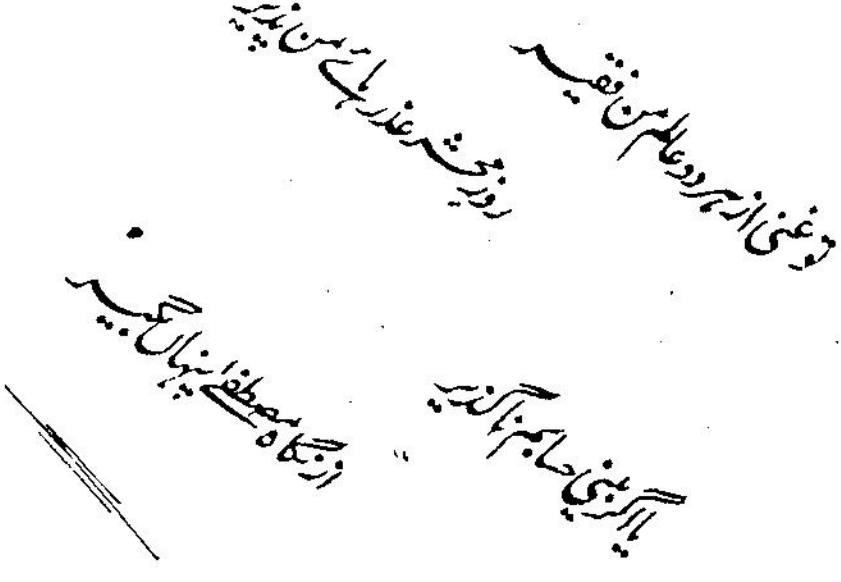

۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء

بیسویں صدی کا آغاز ہے۔ مشرق کی تہذیب و تمدن کے ٹمٹمانے والے آخری چراغ بھی گل ہو چکے ہیں۔ مغرب نے ایک نئے نظامِ تمدن کی طرح ڈالی ہے۔ جس کی درخشندگی اور تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کی قومیں اس تہذیبِ جدید کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہیں۔ جلیل القدر دانایانِ روزگار اس نئے تمدن کو انسانیت کے مصائب و نوائب کے لئے مسیحا سمجھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے مفکر انسانی دانش و بینش کے اس اوجِ کمال پر نازاں و فرحاں دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف سے اس نئی روشنی کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے۔ چاروں سمت سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے اس نسخۂ کیمیا کی برکات کے معترف ہیں ایسا دکھائی دیتا ہے گویا انسان نے اس فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لیا جس کی تلاش میں اسے ساری عمر دشت پیمائیوں اور صحرا نوردیوں میں گذار دی تھی۔ نئے انداز کی سیاست۔ نئی وضع کی معاشرت یعنیت کے طور طریق نرالے تعلیم کے ڈھب انوکھے۔ تمام نظام ہائے کہنہ کی بنیادیں تک اکھیڑی جا چکی ہیں اور نئے نقشوں کے مطابق۔ بالکل جدید بنیادوں پر اس تہذیبِ نو کے قصرِ فلک بوس کی عمارت اوپر کو اٹھتی چلی جا رہی ہے جس کی رفعت و بلندی۔ نقش و نگار۔ آئینہ بندی۔ حریر و اطلس کے نگاہ فریب پردے۔ بجلی کے قمقمے اور ان قمقموں کی عالمتاب روشنی میں ایک رنگین دنیا۔ ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو حیرت کدہ بنا رہی ہے۔ کہ اتنے میں مشرق کے تیرہ و تار ویرانوں کا ایک تیس سالہ نوجوان اس طلسم خانۂ ہوشربا میں جا نکلتا ہے۔ وہ تہذیبِ نو کے اس جہانِ رنگ و بو میں کھویا کھویا ادھر ادھر پھرتا ہے۔ ہر شے پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر چیز کو تجسسانہ نظر سے پرکھتا ہے۔ کہیں رکتا ہے تو پہروں کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا خاک کے ذرّوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ ہر نہاد ایسا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین اسے مستقبل کا درخشندہ ستارہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے اس کمالِ ہوش میں کچھ ایسے غیر محسوس سے جنون کی آمیزش ہے جو اسے دوسرے ہوش مندوں سے یکسر الگ کئے ہوئے ہے۔ وہ فکر و نظر اور ہوش و جنون کے اس نرالے امتزاج سے تہذیبِ جدید کے اس طلسم کدہ کے ایک ایک عنصر کو دیکھتا ہے اور عین اس وقت جبکہ ساری فضا اس نظامِ تمدن کی توصیف و ستائش میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے لبوں پر خفیف سی ہنسی اور اس کی آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی

موج کے ہلکورے نظر آرہے ہیں۔ وہ اس پورے تماشے کو اپنی نگاہوں کے دامن میں سمیٹ کر ٹوٹتا ہے اور لبِ ساحل ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے کہ

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو۔ وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اور یاد رکھو کہ :۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سننے والوں نے سنا اور اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ایک فلک بوس قہقہہ لگایا اور اس کے بعد پھر اسی کیف و مستی کے دنیا میں جذب ہو گئے۔ یہاں پہنچنے پر پوچھنے والوں نے پوچھا کہو بھائی! حیرت خانۂ مغرب کی سیر تو کی وہاں تہذیب نو کے پری محل کو بھی دیکھا! کیا خیال ہے؟ اس نے اپنے مخصوص انداز میں نگاہوں کو اٹھایا اور کہا کر ــــ ہاں دیکھا! چمک دمک تو بڑی ہے۔ لیکن

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے۔ آئینہ دیوار بھی ہے

زمانہ آگے بڑھتا گیا شیشۂ گرانِ فرنگ اپنے کاخِ تہذیب کی آئینہ بندی میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور انہماک سے مصروف رہے۔ دنیا اسے بدستور خدا کی رحمت تصور کرتی رہی۔ انسانیت اسی طرح اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔ تا کہ ۱۹۱۴ء میں ایک عالمگیر دھماکہ محسوس ہوا۔ دھماکہ زلزلہ کی صورت اختیار کر گیا اور چار برس تک متواتر بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ میدانوں کا ذرہ ذرہ انسانی خون کی ارزانی کی زندہ داستانیں بن گیا۔ لیکن مغرب نے اس کے بعد پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور اس عصرِ جدید کی تزئین و آرائش اور حفاظت و صیانت میں پہلے سے بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ سطح بیں نگاہوں نے اس "ہوشمند دیوانہ" سے پھر پوچھا کہ اب کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ کی وہ پہلی پیشین گوئی تو غلط ثابت ہوئی! اس مردِ دانا کی آنکھوں میں پھر تبسم کی لہر دوڑی۔ اور اب کے پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو کر دوڑی۔ اپنے مخصوص انداز میں سر اٹھایا۔ اور کہا کہ میری آنکھوں نے غلطی نہیں کی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا۔ حرف حرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ مغرب کو یہ فطرت کی طرف سے پہلی تنبیہ ملی تھی وہ اس سے عبرت حاصل کرتے تو بچ جاتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور میری آنکھیں پھر دیکھ رہی ہیں کہ

فانیؔ راکہ دو صد فتنہ در آغوشش بود   دخترے ہست کہ در مہد فرنگ است ہنوز

سننے والوں نے اسے سنا اور مسکرا ان سنی کر دی۔ مغرب کے نقشوں کی روشنی اپنی خیرگی میں اور بھی بڑھتی گئی۔ اب ساری دنیا اس کی نقال تھی۔ اور اس نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ پوچھنے والوں نے پھر اس مجذوب زیرک سے پوچھا کہ فرمائیے! آپ کیا کہتے ہیں۔ اب تو اس قصر بلند کی رفعت کہکشاں تک جا پہنچی ہے۔ اس نے پھر ایک سیلاب تبسم سے پوچھنے والوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی   یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

الٹ جائیں گی تدبیریں۔ بدل جائیں گی تقدیریں   حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

دنیا نے اس پر ایک قہقہہ لگایا اور مغرب اپنی شیشہ گری اور مشرق اس کی نقالی میں پھر مصروف ہو گئی۔ اور وہ مرد زیرک پھر اپنی گہری سوچ میں ڈوب گیا مغرب نے زمین پر جال بچھا لیا۔ مغرب نے آسمان پر قابو پا لیا۔ اس نے پانی پر اپنا تسلط جما لیا۔ اس نے خشکی اور تری کو مسخر کر لیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے پورے سامان مہیا کر لئے ادھر یہ ہوتا گیا اور ادھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دانائے راز پر کچھ عجیب سراسیمگی کا عالم طاری ہو رہا ہے وہ بیٹھا بیٹھا اس طرح چونک اٹھتا جیسے ایک حسین و معصوم بچہ خواب میں دہشت ناک عفریت خونخوار کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ وہ تصور ہی تصور میں کچھ دیکھتا اور یوں ڈر کر سہم جاتا جیسے آگ اور خون کا کوئی سیلاب بلا خیز بہتا چلا آ رہا ہو۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر دور افق سے اس پار۔ کچھ دیکھتا اور بیساختہ چلا اٹھتا کہ

شفق نہیں مغربی افق پر۔ یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے!

طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو!

اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ!

وہ دیکھو!   جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا۔ وہ عالم پیر مر رہا ہے!

جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ!

وہ راتوں کی تنہائیوں میں اکیلا دیوانہ وار ادھر ادھر پھرتا۔ کبھی آسمان کے خاموش ستاروں سے باتیں کرتا کبھی ندی کی ساکت روانیوں سے محو تکلم ہوتا۔ وہ جنگل کے ویرانوں سے۔ وہ شہر کی اس محفل نغمہ و شراب کی چکا چوند کو دیکھتا جسے بڑے بڑے ہوشمندوں نے باعث گرمی کائنات سمجھ رکھا تھا۔ تو ایک ٹھنڈی سانس بھرتا

اور اپنے سینے کے داغوں کو نمایاں کر کے پکار اٹھتا کہ

وہ بزمِ عیش ہے مہمانِ یک نفس دو نفس — چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ

اور — دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا — قریب آگئی شاید جہانِ پیر کی موت

وہ کبھی کبھی نخلستان کے قریب کھجوروں کے جھنڈ کے سایہ میں وجد و مستی میں رقص کرتا اور مطربِ فطرت کی لے نوازی کی ہم آہنگی میں والہانہ انداز میں گاتا نظر آتا کہ

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے!

گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا!

ایک حجازی قافلہ پاس سے گذر رہا تھا۔ سالارِ کارواں نے اس تماشہ کو حیرت سے دیکھا اور کہا کہ بابا! یہ کیا کہتے ہو۔ آؤ! تمہیں دکھائیں کہ اس تہذیب نو نے ہمارے عروقِ مردہ میں کس طرح ایک نیا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے اس لے اس سادہ لوح میر کارواں کی بات سنی اور ہنس کر کہا کہ اے نادان!

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر — یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اس نے پوچھا کہ پھر ہوگا کیا؟ فرمایا کہ

آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت — آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

اس لے پوچھا کہ اس کے لئے پھر کرنا کیا چاہیئے۔ جواب ملا کہ

اگر در دلِ جہانِ تازہ داری بروں آور

کہ افرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتاد است

اس لے سمجھا کہ شاید دنیائے مسیحیت پھر کسی صلیبی جنگ کے ارادے کر رہی ہے۔ لیکن اس مردِ دانا نے کہا کہ نہیں۔

من از ہلال و چلیپا دگر نمی اندیشم

کہ فتنۂ دگرے در ضمیرِ ایام است

اس لے کہا کہ مغرب کے آہنی پنجے تو زمین و آسمان کو اپنی قاہری گرفت میں لئے بیٹھے ہیں اس چنگل سے رستگاری بھلا کیسے ممکن ہے! مردِ قلندر ہنسا اور اس لے کہا کہ اس گرفت کی شدت بجا اور درست لیکن

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر — کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب — ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

لیکن یہ باتیں اس پوچھنے والے کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ تصوّر بھی نہیں کرسکتا تھا کہ مغرب جو اس قدر بے پناہ قوتوں کا مالک ہے۔ کبھی تباہ و برباد ہوسکتا ہے۔ وہ شوکت و سطوت۔ غلبہ و تسلّط۔ استیلا۔ وقہرمانی کے اس بحرِ موّاج کو دیکھتا اور کانپ اٹھتا۔ وہ بھلا کیسے باور کرلیتا ہے کہ کہنے والا سچ کہتا ہے۔ لیکن کہنے والا کچھ ایسے جزم و یقین سے کہہ رہا تھا گویا اس کے سامنے سینما کا ایک فلم چل رہا ہے جسے اپنی آنکھوں سے دیکھکر وہ بتاتا جاتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے اس پوچھنے والے سے کہا کہ تیری حیرت اور استعجاب درست! لیکن جو میں کہتا ہوں وہ بھی غلط نہیں۔

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج — موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس — سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں میرے آئینۂ گفتار میں — آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

سننے والے نے سنا تو سنا کہ ان باتوں میں لذت و جاذبیت بہت تھی لیکن اسے محض "شاعری" ہی سمجھا اور دادِ سخن دیکر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے جاتے بھی اس مردِ قلندر نے اسے آواز دی اور کہا کہ میری باتوں کو شاعری نہ سمجھ۔ یہ حقیقت ہے۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

لیکن سننے والے نے اسے بھی شاعری ہی سمجھا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس مردِ دانا نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھکر کہا

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

دنیا اپنی روش پر بدستور چلی جارہی تھی۔ تہذیبِ مغرب اپنے پورے شباب پر تھی۔ نظامِ افرنگ کی رعنائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ لیکن یہ فقیر کجکلاہ برابر اپنی پکار کو دہرائے جارہا تھا کہ

عذرا اے پیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کسی کی سمجھ میں یہ معمہ نہیں آتا تھا کہ اس دیدہ ور کو کیا نظر آ رہا ہے جس کی بنا پر یہ اس شدت و اصرار سے اپنی بات کو دہرائے جا رہا ہے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ مغنی آتش نفس خلوت و جلوت بستی اور ویرانہ میں ہر جگہ اپنے پیغام کو پہنچائے جا رہا تھا۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم　　غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آنجا　　حدیث دل بزبان نگاہ می گویم

جب پوچھنے والے زیادہ اصرار کرتے تو وہ ایک ہلکے سے معنی خیز تبسم سے اتنا کہہ دیتا کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں!

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

اس سے ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی اور وہ زیادہ کاوش سے بات کریدنے کی کوشش کرتے تو یہ خمکدۂ حجاز کا متوالا یارانِ میکدہ سے کہہ دیتا کہ

بگرداں جام و از ہنگامۂ افرنگ کمتر گو

ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے در پے

متجسس قلوب سے تو وہ اس شانِ دلربائی سے باتیں کرتا لیکن اگر کوئی ضد اور کد سے ان حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس سے ذرا کھلے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتا اور برملا کہہ دیتا کہ

گفت اے گندم نمائے جو فروش　　از تو شیخ و برہمن اندر خروش

حکمتے کو عقدۂ اشیاء کشاد　　با تو غیر از فکرِ چنگیزی نداد

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگیست　　باش تا بینی کہ انجامِ تو چیست

وہ کچھ اس قسم کی باتیں کرتا لیکن اس کی باتوں میں کچھ ایسی حلاوت تھی کہ ہر ایک کا جی چاہتا کہ اس سے ذرا اور قریب ہو کر اس کی باتیں سنی جائیں۔ لوگ قریب تر ہوتے تو وہ ذرا اور دور ہو جاتا کہ اپنا محرمِ راز کسی کو نہ پاتا وہ اپنی باتیں اپنے دل سے زیادہ اطمینان سے کرتا۔ لیکن پھیر سے کرتا یا اپنے آپ سے۔ آنے والے انقلاب کے تصور سے اس کا دل طلسم پیچ و تاب بنا رہتا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور دعائیں مانگتا کہ

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب　　یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یا چناں کن یا چنیں!!

وہ زمانہ کی بے کیف گردشِ دولابی سے گھبرا اٹھتا اور خالقِ فطرت سے اپنے عجیب محبوبانہ انداز میں کہتا کہ

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے نواز کی نوا میں تلخی اور لے میں سوز بھی زیادہ ہوتا گیا۔ وہ اب حقائق کو زیادہ نکھرے ہوئے الفاظ میں بیان کرنے لگ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو چیزیں پہلے اس کے عالمِ تصور میں دھندلے سے خواب کی صورت میں متشکل تھیں اب محسوس پیکر اختیار کر رہی ہیں اب وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتا کہ ؎

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں　　ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز　　جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ ارمغانِ حجاز آخری تصنیف)

ابلیس کے ایک دوسرے مشیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ　　کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر　　جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج　　کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے　　جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

غرضیکہ وہ صاحبِ خرد و جنوں اس تہذیب کے آل سے دنیا بھر کو آگاہ کئے جاتا رہا۔ لیکن دنیا کی وہی حالت رہی کہ اس کی باتوں کو سنا اور پھر اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ زمانہ یوں ہی گذرتا گیا کہ ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ یہ مردِ درویش کچھ اس انداز سے مضطرب و بیتاب ہے جس طرح بعض پرندے طوفان آنے سے پیشتر اضطراب و سراسیمگی میں ادھر ادھر اڑتے اور چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ بابا! خیر ہے؟ آج یہ بے کلی اور بے چینی کیوں ہے؟ کہا کہ تمہیں کیا بتاؤں! اگر عافیت چاہتے ہو تو اب بھی اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو خدائے قوی و مقتدر کی حفاظت میں لے آؤ ورنہ یاد رکھو کہ طوفانِ بلا انگیز میں خس و خاشاک کی طرح بہ جاؤ گے

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے　　فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

بستی والوں نے سنا اور حسبِ دستور ایک خفیف سی ہنسی سے اس کا استقبال کیا۔ رات کو معمولاً محفلِ رقص و سرود

میں جو کیف و سرور ہے۔ آخری شب آنکھ لگی تو محسوس ہوا گویا زلزلے کے جھٹکے آ رہے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ دیوانگی میں ادھر ادھر بھاگے۔ دیکھا تو اس قصرِ رشید کی بنیادیں تک ہل رہی ہیں جس کے متعلق کبھی تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ یہ متزلزل ہو سکے گا۔ آندھی اور جھکڑ کا طوفان۔ زلزلے کے جھٹکے۔ یہ مکان گرا۔ وہ دیوار ٹوٹی باہر تند و تیز بارش۔ اندر تباہی و بربادی۔ سامنے ڈنسرگ کی پہاڑیوں کو دیکھا تو آتش فشاں چوٹیوں سے لاوے کا سیلاب امنڈا چلا آ رہا ہے اور جو کچھ سامنے آتا ہے اسے اپنے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں لئے بربادیوں کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے بستی والوں کو اپنے پرائے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ مردِ دانا کیا کہتا تھا! اس سراسیمگی میں اٹھے اور اس فقیر کی کٹیا کی طرف لپکے کہ اسی دانائے راز سے پوچھیں کہ اس سیلابِ فنا سے بچنے کی بھی کوئی صورت ہے بھاگے بھاگے کٹیا پر پہنچے۔ لیکن دیکھا تو کٹیا خالی ہے۔ وہ مردِ درویش کہیں چلا گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی تھی۔ کٹیا کے اندر عین وسط میں نورِ قرآنی کی قندیل جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ ایک طرف ایک کدوئے کہنہ میں عشقِ محمدی کی شرابِ کوثریں چھلک رہی تھی اور سامنے دیوار پر جبریل کے پر ملنے سے لکھا تھا کہ

سرودِ رفتہ باز آید نیاید — نسیمے از حجاز آید نیاید!
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید نیاید

بستی والوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک کشکول دکھائی دی جس کے اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔

بحضورِ ملت

دیکھا تو اس میں کاغذات کے کچھ ٹکڑے نہایت ترتیب سے رکھے ہیں۔ سب سے اوپر ۱۹۱۰ء کا ایک ٹکڑہ ہے یہ وہ وقت تھا جبکہ ملتِ بیضا کا انحطاط اپنی انتہائی پستی تک پہنچ چکا تھا اور کہیں کسی طرف۔ امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ عین اس مایوسی اور بیکسی کے ماحول میں اس ابدؔوں کے شاہزادے نے گرتی ہوئی قوم کا بازو تھاما اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ کیوں گھبرائے ہو۔ کیوں خوف کھاتے ہو۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ میں نے قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہو گا

لوگوں نے سنا اور ایک معنی خیز تبسم سے اس کا استقبال کیا کہ یہ انحطاط اور اس پر یہ موہوم امیدیں! اس کے پیچھے ۱۹۱۲ء کا ایک پرزہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگ بلقان میں ملت اسلامیہ کے ترکش کا آخری تیر بھی نشانہ خطا کر کے ٹوٹ کر گر چکا تھا سطوتِ اسلامیہ کے ابھرنے کی بظاہر کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ مایوسیوں کی تاریکی نے چاروں طرف سے گھیر ڈال رکھا تھا۔ اس ظلمت و تاریکی میں وہ شمع بردار کاروانِ حجاز اٹھا اور اپنی لحن میں پکار کر کہا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں آ۔ اور —— جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ —— دیکھ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کہ کس طرح

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس کے ساتھ ہی ایک اور ٹکڑے پر یہ لکھ رکھا تھا ؎

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی!
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل بر انداز ہے خونِ شہداء کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنّابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے
(جوابِ شکوہ)

اُدھر یورپ کے میدانوں میں خونِ مسلم کی یوں ارزانی ہو رہی تھی اور ادھر ہندوستان میں انہی دنوں ایک ایسی تحریک کی ابتدا تھی جو آتشِ خاموش کی طرح وحدتِ ملت اور عالمگیریت اسلام کو اندر ہی اندر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دینے والی تھی۔ اس مردِ دانا کی نگہ دوررس اگر ایک طرف لالہ زارِ مغرب کے آتشیں منظر پر محوِ خونابہ فشانی تھی تو دوسری طرف اس تحریکِ جدید کی ہلاکت سامانیوں سے بھی غافل نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہ تھا کہ قومیت پرستی (یعنی وطن کو وجۂ جامعیت قرار دے کر متحدہ قومیت کی تشکیل) میں بھی مسلمانوں کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔ بڑے بڑے دردمندانِ ملت اپنی وطن پرستی پر فخر کرتے نظر آتے تھے۔ لیکن ان سب میں اکیلا یہ مردِ دانا تھا جس نے بلند آہنگی سے پکار کر کہا کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تہذیبِ مغرب کی تقلید میں نیشنلزم گویا وقت کا فیشن بن گیا تھی۔ مہذب ہونے کا ثبوت یہ تھا کہ انسان نیشلسٹ ہو عین اس زمانہ میں اس دیدہ ور کی نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ نیا فلسفہ کس قدر اسلام کے بنیادی خطوط سے متضاد و متبائن ہے۔ اس نے قوم کو جھنجھوڑ کر کہا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

اس لئے کہ:- نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا!
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے (۱۹۰۸ء)

اس کے بعد ایک اور ورق ملا۔ یہ اس زمانہ کا لکھا ہوا تھا جب ہندوستان میں جدید اصلاحات کا دور دورہ تھا جن کی رو سے یہاں مغربی انداز کے جمہوری نظام کی طرح ڈالی گئی تھی۔ وقت وہ تھا کہ مغربی جمہوریت کو نوعِ انسان کی تمام مصیبتوں کا حل بتایا جاتا تھا۔ اسی میں اصل آزادی کا راز مضمر سمجھا جاتا تھا۔ تمام ہندوستان نے جمہوری نظام کی طرف ان اصلاحی اقدام کا خیر مقدم کیا حتیٰ کہ مسلمانوں کی طرف سے تو بلند آہنگی سے نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے۔ اور کسی نے یہ نہ سمجھا کہ اس جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کس قدر بعد المشرقین ہے یہ جمہوریت وہ تھی جس کی رو سے قانون سازی کا اختیار انسانوں کی ایک جماعت کے سپرد کیا جاتا تھا اور یوں اقلیت پر اکثریت کے فیصلوں کی پابندی لازم تھی۔ ادھر ساری دنیا (اور ہندوستان کے مسلمان) ان جمہوری اصلاحات پر چراغاں کر رہے تھے اور ادھر یہ مردِ دانا انھیں متنبہ کر رہا تھا کہ یاد رکھو۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق   طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس ورق کے دوسری طرف لکھا تھا ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو   کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

انہی دنوں کا لکھا ہوا ایک اور ورق ملا۔ زمانہ وہ تھا جب یورپ کے گدھ (ترکی کے) مرد بیمار کی لاش پر منڈلا رہے تھے۔ عرب و عجم پر مسلمانوں کی رہی سہی قوتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ جنگ عظیم کے بعد کے اثرات سے ملت اسلامیہ کا جسم ناتواں نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ زمانہ جس میں

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ   خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو   مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

اس عالمگیر مایوسی میں جبکہ کہیں سے شعاع امید جلوہ افروز نظر نہیں آتی تھی۔ اس مرد مومن نے اپنی قرآنی فراست سے دیکھا کہ مایوسیوں کے ان خوفناک بادلوں کے پیچھے امید کی سنہری کرن بھی موجود ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈوبتی ہوئی قوم کو حوصلہ دلایا کہ وجۂ اضطراب کچھ نہیں۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی!
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی۔ ذہنِ ہندی۔ نطقِ اعرابی

اس کے نیچے لکھا تھا ؎

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اُدھر اس قدر تابناک امیدوں کی قندیل کو روشن کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی ہمسائیگی میں بسنے والے ترکوں کو اس سے بھی آگاہ کر دیا کہ یاد رکھو کہیں تم نے بھی تہذیب مغرب کے فریب میں نہ آجانا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خرومندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب روس کا بالشویکی نظام عالمگیر حیثیت اختیار کئے جا رہا تھا اور چونکہ یہ نظام۔ سرمایہ داری کا ردِعمل تھا اور گھبرایا ہوا انسان یہ سمجھ رہا تھا کہ بس وہ تریاق ہاتھ آگیا جو زمانہ حاضر کے ہر قسم کے زہر کا مداوا ہے۔ اپنے مرکز سے ہٹا ہوا مسلمان بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاں! یہ نظام عین اسلامی نظام ہے۔ اس عالمگیر غلغلہ اندازی میں اس مردِ دانا نے اس نظام اشتراکیت کا تجزیہ کیا اور فریب خوردہ مسلمان کو بتایا کہ یہ بھی سراب ہی سراب ہے۔ تو میں صرف تخریب (لا) سے بلند نہیں ہوا کرتیں اس کے ساتھ تعمیر (الّا) کی بھی ضرورت لاینفک ہوتی ہے۔ نظام اشتراکیت پر غور کرو۔

فکرِ او در تندبادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے الّا نراند

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تندباد آرد بروں

در مقامِ لا نیاساید حیات
سوئے الّا می خرامد کائنات

لا و الّا سازو برگِ اُمتاں
نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب یورپ نے بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کے لئے مجلسِ اقوام کی طرح ڈالی تھی اور دنیا خوش تھی کہ اب نزاع اور جھگڑوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ جنگ نابود ہو گئی۔ اب کمزوروں پر ظلم و استبداد روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر ایک کی دادرسی ہو گی۔ دنیا خوش اور مطمئن تھی۔ لیکن اس مردِ دانا نے سر ہلا یا اور کہدیا کہ

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن!
دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند!

اس کے نیچے لکھا تھا ؎

نقش نو اندر جہاں باید نہاد | از کفن دزداں چہ امید کشاد
در جنیوا چیست غیر از مکر و فن | صید تو ایں میش و آں نخچیر من
نکتہ ہا کو می نگنجد در سخن | یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر ہندوستان میں وطن پرستی ـ متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگ زمین وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور بھولا بھالا مسلمان بلا سوچے سمجھے اپنے ہاتھوں سے اس دام کے حلقے کستا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ دانائے راز برابر پکارتا چلا جا رہا تھا کہ یاد رکھو یہ سراب رنگ و بو ہے یہ تمہاری غلامی کی نئی زنجیریں ہیں۔ وطنیت کی بنا پر قومیت کا تصور نہیں دور اسلام سے نکال کر عہد جاہلیت کی طرف لے جائیگا ایک کاغذ کے پرزے پر اس بحری تار کی نقل تھی جو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے مسلمان نمائندوں کے نام بھیجی گئی تھی کہ دیکھنا کہیں مخلوط انتخاب کو تسلیم نہ کر لینا۔ یہ تمہاری جمعیتِ اسلامی کی بنیادیں اکھیڑ کر رکھدے گا۔ ایک یادداشت کا ٹکڑا اس کا موجود تھا جس میں نہرو رپورٹ کی مخالفت کی تلقین تھی۔ ۱۹۳۰ء کی لکھی ہوئی ایک لمبی چوڑی دستاویز ایک خریطہ کے اندر سنبھال کر رکھی ہوئی ملی۔ اس میں بڑے کام کی باتیں تھیں۔ ایک مقام پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایۂ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔"

بستی کے لوگ کشکول کی ان دستاویزوں کو کھول رہے تھے اور فقیر کی ہیبت ان کے دلوں پر چھائے جا رہی تھی وہ محسوس کرتے تھے کہ گویا وہ ابھی تک کٹیا کے اندر ہی ہے۔ ان دستاویزوں کا انداز کچھ ایسا لاہوتی سا تھا کہ وہ اس زمین کی باتیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔

پھر کچھ اور متفرق یادداشتیں ملیں کسی میں افسردہ دل صوفی سے کہا گیا تھا کہ ؎

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علم لاہوتی | حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور | تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کہیں ظواہر پرست ملّا سے تخاطب تھا کہ ۔

فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی! — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

کہیں اس زمانہ کے جھوٹے مدعیان امامت و نبوت سے خطاب تھا کہ

فتنۂ ملّت بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

کہیں افرنگ زدہ مسلماں سے کہا گیا تھا کہ

ترا وجود سراپا تجلّیٔ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے خالی ہے — فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

کہیں ارباب فنون لطیفہ کو مخاطب کرکے کہا گیا تھا کہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو! — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا؟

کہیں فلسفہ والوں کو مخاطب کرکے کہا گیا تھا کہ

سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دُوری

بستی والے ان یادداشتوں کو دیکھتے تھے اور حیران ہوئے جاتے تھے کہ یہ مردِ قلندر کس مقامِ بلند پر تھا کہ اس کے سامنے ہر شے اپنی اصلی شکل میں بے نقاب ہو جاتی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کے محاسن و معائب کو کس طرح کھلے ہوئے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اس چھوٹی سی کٹیا کے اندر رہتے ہوئے اس کی نگاہ کس طرح

یک چمن گل۔ یک نیستاں نالہ۔ یک خمخانہ مے۔

اپنے دامن میں رکھتی تھی کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور علم و سائنس کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کو یہ محیط نہ ہو
ایک پرزہ دیکھا تو اس پر گویا آتشیں حروف میں چند شعر لکھے ہوئے ملے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

پڑھنے والوں میں سے ایک نے کہا کہ جن صاحب کا نام لیا گیا ہے یہ تو سنا ہے کہ کسی دینی مکتب کے صدر

مدرس تھے۔ ایک گوشے میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو واقعی صدر مدرس تھے لیکن اس فقیر دانا کو تم کیا سمجھتے ہو! اس کی شکل وصورت اور وضع قطع پر نہ جاؤ۔ اس کے لگتے کا عالم ہم نے تو اپنی زندگی میں دیکھا نہیں بستی والے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے اور بیٹھے سر پیٹ رہے تھے کہ ہم نے اس دانائے راز کی کچھ قدر نہ کی یہ تو بیٹھے ہی بیٹھے دنیا کو کچھ سے کچھ کر گیا ہے۔ بستی والوں نے اس مرد بزرگ سے پوچھا کہ سائیں بابا! یہ تو بتاؤ کہ یہ مرد دانا اس قسم کی باتیں کہتا کس طرح سے تھا۔ یہ تو ہمیں کسی اور ہی دنیا کا انسان نظر آتا ہے۔ اس نے کہا کہ لوگوں کی یہی تو بھول ہے۔ یہ مرد دانا اسی دنیا کا انسان تھا۔ اس نے نہ (معاذاللہ) نبی ہونے کا دعوٰے کیا نہ مہدی کا نہ وہ مجدد دین کا مدعی ہوا نہ امامت کا۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا سادا مسلمان کہا اور بس بستی والوں نے پوچھا کہ ہماری بات تو وہیں کی وہیں رہی کہ جب اس نے کوئی دعوٰے بھی نہیں کیا تو پھر وہ ایسی باتیں کس طرح کہتا تھا۔ مرد بزرگ نے کہا کہ میں نے خود اس سے یہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں مرد دانا نے اپنے مخصوص تبسم سے کہا کہ اس میں کرامات کی کوئی بات نہیں۔ **اپنی آنکھیں** جن پر کسی بیرونی اثر کا رنگین چشمہ نہ ہو اور **قرآن کریم کی روشنی** بس سے وہ فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم ۔۔۔ ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزہ چشم ۔۔۔ جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

میری صہبائے بصیرت (مرد دانا نے کہا) خمکدۂ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آتی ہے جس میں خالص **قرآن** ہوتا ہے۔ یہ کہا اور مردِ دانا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے فرمایا کہ کیا آپ نے میری وہ دعا نہیں سنی جو آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی کے تحائف کے ساتھ میں نے بحضور خواجۂ کونین پیش کی ہے سنئے کہ میں نے کیا درخواست پیش کی ہے۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ۔۔۔ ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن ۔۔۔ ایں خیاباں راز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا ۔۔۔ بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

آخری مصرعہ پڑھا اور پڑھتے ہی وہ مردِ دانا بچوں کی طرح ہچکیاں لیکر رونے لگ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سر سے پاؤں تک قلب ہی قلب ہے جو سوز و گداز و تپش و خلش کا نازک آبگینہ ہے۔

بستی والے اس مرد بزرگ کی باتیں سن رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں طلسم اضطراب موجزن تھا۔ انھوں نے دیکھا تو ایک پرزے پر لکھا تھا۔

پس از من شعر من خوانند و مے یابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہ ہے!

بستی والوں نے اس شعر کو دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگ گئے جب ذرا سنبھلے تو کہا کہ اے کاش! ہمیں یہ بھی بتادیا ہوتا کہ بالآخر اب ہم کریں کیا؟ دیکھا تو ایک ورق پر لکھا تھا۔

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو — مومنِ خود۔ کافرِ افرنگ شو
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست — آبروئے خاوراں در دستِ تست
ایں کہن اقوام را شیرازہ بند — رایتِ صدق و صفا را کن بلند
اہلِ حق را زندگی از قوّت است — قوّتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوّت بے رائے جہل است و جنوں

بستی والے افسردہ و غمگین کٹیا سے باہر آگئے ہر ایک کی آنکھیں متلاشی اور قلب متمنی تھا کہ اے کاش! وہ مردِ دانا کہیں سے پھرتا پھراتا ایک مرتبہ پھر ادھر آنکلے۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ انھوں نے سنا کہ دُور پہاڑی کے دامن میں میٹھے میٹھے سروں میں کوئی گائے جا رہا ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

قائد اعظم

اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

ایسی آنکھ بھی مل سکے گی جو تاریکی کے جانے اور روشنی کے آنے کے درمیانی لمحہ کو بھانپ سکے حقیقت یہ ہے کہ ان ہر دو مراحل کے درمیاں مد فاصل ہوتی ہی نہیں روشنی ایک چمک ہے۔ جونہی وہ پیدا ہوئی۔ اندھیرا غائب ہو گیا۔ خواہ وہ اندھیرا سالہا سال کا بھی پرانا کیوں نہ ہو۔ قلب و دماغ کی دنیا میں اس کا نام انشراح صدر ہے اس میں شبہ نہیں کہ علم ہی وہ نور ہے جس کے آنے سے جہالت کی تاریکی کافور ہو جاتی ہے۔ لیکن علم کے لئے ضروری نہیں کہ وہ انسانوں کے متعین کردہ نصاب کے چکروں سے گذر کر ہی حاصل ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو قلب سلیم اور ذہن رسا عطا فرمائے تو ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی وادئی نور سے ایک بار گذرنے سے ہی اس کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا ہو جائے جو حقیقت اشیاء کو بے نقاب اور رموزِ دین کو اس طرح بے پردہ دیکھ لے جو دوسرے کو عمر بھر کی ورق گردانی کے بعد میسر نہ آ سکے۔ اس قسم کے انشراح صدر اور کشفِ غطا کی بہت سی مثالیں سامنے آ سکتی ہیں لیکن ان میں نزدیک ترین مثال وہ ہے جو ناخدائے کشتی ملت جناب محمد علی جناح کی نگہ حقیقت بیں میں بصیرت فرقانی بن کر چمکی ہے۔ جناب جناح کے خلاف، کتاب خوان طبقہ کی طرف سے جو اپنے آپ کو حقائق دینی کا واحد اجارہ دار سمجھتا ہے۔ ہمیشہ یہ اعتراض عائد کیا جاتا ہے کہ یہ مسٹر کیا جانے دین کسے کہتے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ اگر دین جاننے سے مفہوم یہ ہے کہ وہ کافیہ، قطبی پڑھا ہوا ہے یا نہیں۔ تو بیشک مسٹر جناح دین سے ناواقف ہے۔ لیکن اگر سوال یہ ہے کہ وہ دین کی حقیقت سے واقف ہے یا نہیں تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ایام میں اپنے اس مخلص بندے کو وہ بصیرت فرمائی ہے جس کے لئے ہمارے بڑے بڑے "مدعیانِ علم شریعت" کو دعائیں مانگنی چاہئیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ آج ہمارا علماء کرام کا طبقہ اپنے اسی علم دین پر ناز کرتا ہے جو انہیں یہ سکھا رہا ہے کہ ہندوستان میں مغربی اصول جمہوری کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ حکومت قائم کی جائے جس میں اکثریت کے فیصلے قانون کی حیثیت اختیار کریں! باقی رہا اسلام۔ سو اگر مسلمانوں کو نماز۔ روزہ کی اجازت حاصل ہو جائے تو بس مقصد حاصل ہو گیا! اس کے برعکس یہ دیکھئے کہ مذہب اور اس کے لوازم کے متعلق یہ مسٹر کیا کہتا ہے اور اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ رموز دین سے یہ طبقہ علماء کرام واقف ہے یا مسٹر محمد علی جناح۔

۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کو جناب جناح حیدرآباد تشریف لے گئے۔ وہاں بعض نوجوان طلباء ملے۔ ان سے کچھ سوالات کئے
اس مکالمہ کو مسٹر محمود علی صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) نے محفوظ کر لیا اور اب اورینٹ پریس کی وساطت سے شائع ہوا
ہے۔ یہ مکالمہ انگریزی زبان میں ہوگا لیکن اخبارات میں اس کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے انقلاب
(۱۰ فروری ۱۹۴۸ء) کا پرچہ ہے ترجمہ کی زبان میں کہیں کہیں الجھاؤ نظر آتا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان مقامات میں
سلاست پیدا کر دی جائے۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے کہ دین کے متعلق مسٹر جناح کے کیا خیالات ہیں۔

سوال۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں۔

جواب۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب۔ اشتراکیت۔ بالشویت۔ یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک۔ دراصل اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا

سوال۔ ترکی حکومت تو ایک لادینی اسٹیٹ ہے کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں لادینی حکومت ( ) کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی ابہر حال اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز سو یہ بالکل اہم ہے

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں

اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لئے تعمیل کا مرکز

قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ ...

پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی

اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی

اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے (آپ جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال

آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

سوال۔ وہ سلطنت ہمیں ہند میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔

جواب۔ مسلم لیگ۔ اس کی تنظیم۔ اس کی جدوجہد۔ اس کا رُخ۔ اس کی راہ۔ سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین اور برترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لا سکیں۔ تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے۔

جواب۔ (واقعہ یہ ہے کہ) جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت تقسیم عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں۔ (انہوں نے) صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے۔ اور (اپنے حلقہ سے باہر) اہلیت و مستعدی کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن جن متنوع صلاحیتوں کی ضرورت ہے انھیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور پھر مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

---*---

ان تصریحات پر غور فرمایئے اور پھر سوچئے کہ کیا **دین** یہ ہے جسے مسٹر جناح پیش کر رہے ہیں یا وہ جو خیر سے علماء کرام کی جمعیت کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے وہ "دین" جس میں امتزاج براہیمی و مصطفوی سے ایک ایسی متحدہ قومیت کی تشکیل کی جا رہی ہے جس کی آزادی میں طاغوتی اکثریت کا نظام حکومت کارفرما ہوگا۔ اس کے برعکس مسٹر جناح کا **دین** یہ ہے کہ اطاعت و وفا کیشی میں مرجع صرف خدا کی ذات ہے۔ اور اس کی تعمیل کا مرکز قرآن کریم کے احکام۔ مسلمان نہ کسی بادشاہ

کا حاکم ہو سکتا ہے نہ پارلیمان کا۔ نہ کسی شخص کا نہ ادارہ کا۔ بلکہ وہ صرف اپنے خدا کا محکوم ہو سکتا ہے اس لئے اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام و اصول کی حکومت ہے" اور یہی وہ حکومت ہے جس کے لئے مسلم لیگ برسرپیکار ہے۔ وہ جنہیں علماء کرام یہ ہے مسٹر جناح۔

اگر یہ خدا کی دین نہیں تو اور کیا ہے سچ کہا تھا کسی نے کہ

زسومنات جناح وہ کا شمشیر اقبال"

زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

ان تصریحات کے بعد غور فرمائیے کہ مسلم لیگ کی مخالفت دین خداوندی کے تمکن و ترویج کی مخالفت ہے۔ یا کوئی نیک کام اور یہ بھی کہ ایک ایسی جماعت کی موجودگی میں جس کا نصب العین یہ ہو کہ اس جماعت کی تشکیل ملت میں تشتت و افتراق ہے یا اصلاح و خیر!

فردوس بیک خوشۂ انگور و شم

آزادی ! اور وہ آزادی جس میں اللہ کے بندے اپنے اللہ کے سوا کسی اور کے محکوم نہ ہیں۔
دُنیا میں کسی قیمت پر بھی گراں نہیں۔

اس آزادی کے حصول کے لئے کیا کیا قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں ؟ جایئے ! اور ان میدانوں سے پوچھئے
جہاں کے شفق آگیں ذرات خونِ شہداء کی تابندہ داستانیں اپنی پیشانی پر
نقش کئے بیٹھے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جانِ مدعا کی قیمت جان کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اس کی رحمتوں کے تصدق،
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زلیخا کو اس کے خوابوں کی تعبیر بازارِ مصر میں کوڑیوں کے
دام مل جائے۔ پھر

کس قدر خوش بختی ہے اس قوم کی جسے آزادی جیسی متاعِ بے بہا، خون کے بجائے چند پیسوں کے عوض
مل جائے۔

اور کیسی بدبختی ہے ان کی جو یوسفِ زندگی کو سوت کی انٹی کے بدلے بھی نہ خرید سکیں !!

آج بازارِ ہند میں دس کروڑ فرزندانِ ملت کے لئے ہوئے قافلے کی چھنی ہوئی متاعِ زندگی پھر
سے واپس مل رہی ہے۔ اور اتنی سستی مل رہی جتنی زلیخا کو بازارِ مصر میں مل گئی تھی!

اس سودے کے لئے آج تمہارا امین معتمد علیہ قائد۔ اس بازار بیع و شری میں نکل آیا ہے۔ وہ اپنے لئے
کچھ نہیں خریدنا چاہتا۔ سب کچھ تمہارے لئے ہی لینا چاہتا ہے۔

مسلمانو! آج جناح نے پہلے پہل اپنی جھولی تمہارے سامنے پھیلائی ہے۔ اس جناح نے جس نے
آج تک کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا تو ایک طرف۔ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا !

اور تم سے مانگتا کیا ہے ؟ جان نہیں۔ تھوڑا سا مال۔ وہ مال جس کے متعلق تم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ کس
وقت ہاتھ سے چلا جائے۔ اگر اعتبار نہ ہو تو پوچھو رنگون کے اُن بے سروسامانوں کو
جو کل تک کروڑ پتی تھے اور آج ایک وقت کی روٹی کے لئے محتاج ہیں۔

غنیمت جانو یہ وقت کہ روپیہ تمھارے اپنے قبضہ میں ہے۔ اس میں سے جتنا جناح کی جھولی میں ڈال
دو گے محفوظ خزانے میں پہنچ جائے گا۔ وہاں اپنی حفاظت بھی کرے گا اور تمھاری حفاظت بھی۔
مسلمانو! جناح روز روز نہیں مانگیگا! مقدر کے ستارے روز روز نہیں پلٹیں گے۔ اتفاق سے
حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ تھوڑی سی مالی قربانی بڑے سے بڑے نتائج پیدا کرسکتی ہے۔
جو کچھ کہ تم سے بن پڑے۔ زیادہ سے زیادہ جتنا دے سکو۔ دریغ نہ کرو۔ تأمل نہ کرو۔ اور براہ راست نمبر ۱۰
اورنگ زیب روڈ نئی دہلی کے پتہ پر جناب جناح کے نام بھیجدو۔ چہ عجب کہ اس سے
تمھاری غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں۔ تم دنیا میں پھر سے سر اُٹھانے کے قابل ہو جاؤ۔
شاید یہ موقعہ پھر نہ ہاتھ آئے۔

ہرچہ داری صرف کن در راہِ او
لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا۔

اسلام کا آخری رکن

یہ ایک مقالہ کی تمہید ہے جس کو علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری نے ادا گذشتہ جامعہ ملیہ میں پڑھا تھا۔ چونکہ بقیہ حصہ اس مقالہ کا حج سے متعلق ہے جس پر علامہ موصوف کا ایک بسیط مضمون طلوع اسلام دسمبر ۱۹۳۹ء میں نکل چکا ہے اس لئے اس موقع پر صرف اس کی تمہید ہی شائع کی جاتی ہے۔ (ادارہ طلوع اسلام)

دین اسلام کے پانچ رکن تسلیم کئے گئے ہیں۔ پہلا رکن کلمۂ توحید ہے جس کے اوپر اسلام کی بنیاد ہے۔ کلمۂ توحید بمنزلہ اسلام کے دروازہ کے ہے۔ کوئی شخص دین اسلام میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا اور نہ مسلمان کہا جا سکتا ہے جب تک کہ اس کلمہ کو دل سے زبان سے اور اس کا اقرار نہ کرلے۔ اس لئے یہ سب سے پہلا اور اسلام کا اول رکن ہے دوسرا رکن نماز ہے جس کا ادا کرنا ہر بالغ عاقل مسلمان پر فرض ہے۔ اور جس سے انسان کی صحیح بندگی کا تعلق اپنے خالق اور مالک کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

تیسرا رکن زکوٰۃ ہے جس کا ادا کرنا صرف ان مسلمانوں پر فرض ہے جو صاحب نصاب ہوں یعنی جن کے پاس بڑھتا ہوا مال شرع کی معین کی ہوئی مقدار سے کم نہ ہو اور اس پر سال گذر جائے۔

نماز اور زکوٰۃ مکہ ہی میں فرض ہو چکی تھیں۔ قرآن کی ان سورتوں میں جو مکی ہیں نماز اور زکوٰۃ دونوں کے احکام ہیں۔ بلکہ دونوں بیشتر ایک ساتھ ہی مذکور ہوئے ہیں۔ لیکن مکی آیات میں زکوٰۃ کا جو ذکر آتا ہے۔ اس کی نوعیت اس زکوٰۃ سے جو مدنی آیات میں ہے کسیقدر مختلف ہے۔ کہ میں اسلام کی کوئی اجتماعی طاقت پیدا نہ ہو سکی تھی اور نہ کسی قسم کی سیاسی حیثیت قائم ہو گئی تھی۔ اس لئے وہاں زکوٰۃ صرف رضا کارانہ صدقات و خیرات کا نام تھا۔ بخلاف اس کے مدینہ میں جب اسلام کی اجتماعی زندگی شروع ہوئی اور حکومت الٰہیہ قائم ہو گئی تو اس کے اخراجات کے لئے ملت کے ارباب نصاب سے سالانہ زکوٰۃ وصول کی جانے لگی جس کے قواعد و ضوابط خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرمائے تھے۔ اور وہ اجمالاً یہ تھے کہ ہر صاحب نصاب مسلم سے سال کے خاتمہ پر قریب ۲/۱ ۲ کے زکوٰۃ امام کی طرف سے وصول کی جائے۔ اور جس کے پاس دو سو درہم سے کم یعنے موجودہ سکہ کے حساب سے چالیس روپیہ سے کم ہوں وہ صاحب نصاب نہیں ہے اس سے کچھ نہ لیا جائے۔ کم و بیش یہی نسبت یعنے ۲/۱ ۲ کی مویشی وغیرہ کی زکوٰۃ میں بھی رکھی گئی۔ اس کے ساتھ اپنی مرضی سے خیرات و صدقات کا سلسلہ بھی جاری رہا جو انفرادی تھا

اور جس کے لئے کسی مدون آئین و ضابطہ کی ضرورت نہ تھی۔

چوتھا رکن اسلام کا روزہ ہے جو ۲ھ میں مدینہ میں فرض کیا گیا۔ اور سب سے آخری رکن حج ہے جو ۹ھ میں مکہ فتح ہو جانے کے بعد فرض ہوا۔

میرا خیال ہے کہ یہ آخری رکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قدر عظیم الشان ہے کہ بہت پہلے فرض کر دیا جاتا اگر مکہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہوتا۔ بیت اللہ پر مشرکین مکہ کے تسلط کی وجہ سے اس کی فرضیت میں تاخیر بعید از قیاس نہیں۔ چنانچہ ۶ھ میں جب حضور اکرم کعبہ کے شوق دید میں بیتاب ہو کر مسلمانوں کو ساتھ لیکر عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تو کفار مکہ نے اس عمرہ کے حج سے بھی روک دیا۔ اور مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اس لئے حج کی فرضیت اسی وقت ہوئی جب مسلمانوں کا تسلط مکہ پر ہو گیا۔ اور یہ تسلط ۸ھ میں ہوا۔

قرآن کریم میں غور کرنے سے ہر صاحب بصیرت اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اسلام مجموعی لحاظ سے اجتماعی دین ہے یعنی وہ تمام بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نظام ہے۔ بیشک وہ انفرادی تعلیمات بھی پوری پوری اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن ان تعلیمات سے وہ افراد کا تزکیۂ نفس اور ان میں تقویٰ و طہارت پیدا کر کے ان کو ملت کا جزء مصلح بنانا چاہتا ہے تاکہ پوری ملت کی زندگی ایک نجات یافتہ زندگی ہو جائے۔ یہاں ضمناً اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ اسلام کی اجتماعی زندگی جو خلافت راشدہ یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی تک قرآن کے مطابق تھی۔ بنی امیہ کی ملوکیت قائم ہو جانے کے بعد سے بالکل بدل گئی۔ نہ صرف اس لئے کہ یہ ملوکیت بجائے حکومت الٰہیہ کے انسانی حکومت تھی جو اسلام کے بالکل منافی تھی بلکہ اس لئے بھی کہ ان نام نہاد خلفاء نے۔ جو سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے جن کا کل زمانہ دو سال تھا سب کے سب در اصل مستبد بادشاہ تھے۔ فوج خزانے اور ملک پر اپنا قبضہ جما کر دین کو افراد کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جس کی وجہ سے اس کا اجتماعی نظام ٹوٹ گیا اور کوئی مرکز اس کی قیادت کے لیے نہیں رہا۔ چنانچہ افراد کی دینی رہنمائی کرنے والوں میں جب آپس میں اختلافات شروع ہو گئے تو ان خرابیوں اور جھگڑوں کو فیصلہ کرنے والی کوئی قوت نہ تھی جو ان کو چکا کر مسلمانوں کو افتراق اور تشتت سے بچا لیتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے لحاظ سے ملت میں نت نئے فرقے پیدا ہونے لگے اور اس کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی جس کی شیرازہ بندی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملت میں پھر نبوت اور خلافت راشدہ کے منہاج پر مرکزیت نہ قائم ہو۔

رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ سوائے وابستگان سلطنت کے جملہ اہل اسلام ملی مشاغل سے نہ صرف فارغ بلکہ غافل ہو گئے

ان میں سے جن کو دین کا زیادہ ذوق ہوتا وہ ظاہری جہاتِ ملت کے دروازے اپنے اوپر بند پاکر باطنی تزکیہ کی طرف توجہ کرکے اپنی نجات کی راہ ڈھونڈتے۔ اس انفرادیت نے عام طور پر رہبانیت پیدا کی اور اوراد و وظائف بالخصوص تصوف سے زیادہ دلچسپی بڑھی[1]۔ اور دماغوں سے ملی مقصد اور اجتماعی نجات کا تصور ہی جاتا رہا۔

میں یہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ اسلام سارے انسانوں کے لئے نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی زندگی کا مکمل نظام ہے جو اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس کے خلاف جو نظام بھی قائم ہوگا وہ غیر اسلامی اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ یہ اسلامی نظام ان پانچوں ارکان کی ادائیگی پر قائم ہے جن سے انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

پہلا رکن توحید جیسا کہ میں نے کہا دین اسلام کی بنیاد ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا انفرادی اور اجتماعی مقصود حیات صرف اکیلے اللہ کی رضامندی ہے اور بس۔ اور یہ اسی کی اطاعت سے مل سکتا ہے سارے قرآن کو آپ چھان ماریئے اس میں سوائے اکیلے اللہ کی اطاعت کے اور مطلقاً کسی کی اطاعت کا حکم نہیں پائیں گے یہ اطاعت الٰہی بذریعہ رسول کے ہوتی ہے۔ اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ رسول ایک منصب ہے۔ نام نہیں ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو فریضے تھے۔

(۱) پیغمبری۔ یعنے اللہ کے پیغامات کو اس کی مخلوق کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔

اس منصب کے لحاظ سے آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہیں تھا بلکہ صرف یہ فرمان تھا یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (اے رسول جو کچھ تجھ پر تیرے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے (لوگوں) کو پہنچا دے۔

(۲) امامت۔ یعنے احکام الٰہی کے مطابق ان کو چلانا۔ ان کے باہمی جھگڑوں اور قضیوں کے فیصلے کرنا۔ اجتماعی امور مثلاً جنگ و صلح وغیرہ میں ان کی قیادت اور نمایندگی کرنا وغیرہ۔

جہاں تک پیغام رسانی کا تعلق ہے یہ منصب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہوگیا اور اس کی تکمیل اور اس کو ختم کرنے کے لئے وہ بھیجے ہی گئے تھے۔ لیکن دوسرا منصب یعنے **امامت** قیامت تک رہنا ہے جس کو بذریعہ ان کے جانشینوں کے ہمیشہ قائم رہنا چاہیئے تھا۔ اس جانشین کے لئے خلیفہ یا امام کا لفظ تاریخی طور پر مستعمل

---

[1] تصوف اسلام سے قبل اقوام و ملل میں رہا ہے اور اب تک ہے۔ مسلمان صوفیوں نے اس میں اسلامی رنگ بھرا لیکن اس کے عناصر کا بڑا حصہ غیر قرآنی ہے جو اسلام کی اجتماعی زندگی میں غیر ضروری ہے۔

رہا ہے لیکن اب یہ دونوں الفاظ اس حد تک اپنے معانی سے دور ہو گئے ہیں کہ ان کے بولنے سے صحیح مفہوم کا تصور مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو مرکز ملت سے تعبیر کروں۔

اسی مرکز کی اطاعت خواہ براہ راست ہو خواہ اس مرکز کے مقرر کئے ہوئے امراء کے ذریعہ سے ہو اللہ کی اطاعت ہے یہ مرکز حکومت الٰہی کا نمائندہ ہے مخلوق کے لئے جو امام اور اس کے مشیروں پر مشتمل ہوگا۔ اور یہ ذمہ دار ہونگے کہ ملت کو قرآن کے مطابق چلائیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد سے یہی مرکزیت امت کی جاتی رہی۔ اور ملت میں لامرکزیت اور انفرادیت پیدا ہوئی جو دن بدن اس کو انتشار اور تشتت کی طرف لئے چلی جا رہی ہے۔

اس بیان سے میرا مقصد اس امر کی توضیح ہے کہ دین اسلام نے کہ وہی دین الٰہی اور ازلی اور ابدی دین ہے سو حدود کا مرکز صرف اطاعت الٰہی کو قرار دیا ہے۔ یہی وہ مرکز ہے جس سے بنی نوع انسان کے جملہ باہمی جھگڑے اور مناقشے ختم ہو سکتے ہیں اور سب کے سب وحدت اطاعت کی بدولت متحد ہو سکتے ہیں دوسرے لفظوں میں یہی مرکزیت امن عالم کا نقطہ ہے جس پر ایک نہ ایک دن دنیا کو آنا پڑے گا۔ لیکن یہ مرکز عقلی ہے اس لئے اس کی اطاعت کے لئے محسوس مرکز کی ضرورت تھی جو منصب رسالت سے پورا کیا گیا۔ رسول اور رسول کے بعد اس کے جانشین ملت سے یہ اطاعت لیں گے۔ اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے اصول اور احکام یعنی اس کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق اس کو چلائیں گے۔

اس مرکز سے مقرر کئے ہوئے امراء کے ساتھ تو قرآن جمہور کو اختلاف اور تنازع کا حق دیتا ہے لیکن اصل مرکز سے کسی کو برسرپا بی کا حق ہے نہ منازعت کا۔ قرآن نے اس کی تصریح کر دی ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

(کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور رسول[1] (مرکز) کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اپنے معاملہ میں اختیار باقی رہے)

امراء اور جمہور کے تنازع کی صورت میں اس کا فیصلہ مرکز کرے گا جیسا کہ قرآن نے حکم دیا ہے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔

---

[1] ہم ایک مضمون میں جو طلوع اسلام میں اسلامی نظام کے نام سے شائع ہو چکا ہے قرآن کریم سے ثابت کر چکے ہیں کہ جہاں جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا امر قرآن میں ہے وہاں ان سے مراد مرکز ملت کی اطاعت ہے

(اگر تم کسی بات میں آپس میں جھگڑو پڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف مسترد کرو)
اس طرح پر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کا فیصلہ ہو جایا کرے گا اور امت میں کوئی تفرقہ اور کوئی نزاع قائم نہ رہے گی۔

امام کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت کا ہونا قرآن کی تعلیم وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ یعنے ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہوگی۔ کے مطابق لازم ہے۔ اور قرآن کی ہدایت شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ یعنے ان سے حکومت میں مشورہ لو۔ کے مطابق امام امور ہے کہ ان کے مشورہ سے کام کرے۔

یہی امام اور مشیروں کی جماعت ملت کی مرکزی جماعت ہے۔ اس مرکزی جماعت کا نصب کرنا جہاں تک میں قرآن سے سمجھ سکا ہوں ملت کا فریضہ ہے۔ کیونکہ اپنی کتاب میں کہیں اللہ نے خود اس مرکز کے نصب کر دینے کی ذمہ داری نہیں لی ہے۔ جو لوگ امام منصوص کے قائل ہیں ان کے پاس کوئی قرآنی سند نہیں ہے۔

اس مرکزی جماعت کا اصولی قانون اور دستور العمل صرف کتاب اللہ ہے۔ اسی کے مطابق ہر زمانہ میں اس کی ضروریات کے لحاظ سے ضوابط بنائے جائیں گے۔ یہ ضوابط کسی خاص قبیلہ یا قوم یا مخصوص کنبہ یا خاندان کے فائدہ کے لئے نہیں ہو سکتے بلکہ یہ حکومت الٰہی ہوگی جس کا مقصد صرف اقامت حق اور اعلائے کلمۃ اللہ ہوگا تاکہ ہر انسان صحیح طور پر اللہ کا بندہ اور خلیفہ فی الارض ہو سکے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

(میں نے نہیں پیدا کیا جن و انس کو مگر اس لئے کہ وہ میرے بندے بنیں)

جب ہم بولتے ہیں کہ مسلمانوں کا مذہب اور ان کی سیاست ایک ہے تو اس سے مراد ہماری یہی سیاست ہوتی ہے جو حکومت الٰہی ہے اور ہمارا دین ہے۔ بخلاف اس کے آجکل جو مسلمانوں کی ہر جماعت اس قسم کے نعرے لگاتی ہے اس کا مفہوم میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیونکہ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی سیاست اور ان کا مذہب خلافت راشدہ کے بعد ہی سے الگ الگ ہیں۔

اسلام سوائے اس حکومت الٰہیہ کے بقیہ جملہ اقسام کی حکومتوں کو طاغوتی قرار دیتا ہے۔ بادشاہت جس کا تسلط خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں پر ہوا اور جس کے ساتھ آج تک بھی ان کا ایک حصہ بدقسمتی سے وابستہ ہے وہ تو اکثر حالتوں میں دنیا کے لئے ایک مصیبت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ بادشاہ اور اس کے ارکان حکومت وزراء اور امراء اور عمال اور فوج سب مل کر اپنی قوت سے پورے ملک کے باشندوں کو تاج کا غلام بنا لیتے

ہیں اور رعایا کی محنت کو اس کے اور اس کے تحت میں اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

آجکل جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ دو قسموں کی حکومتیں دنیا میں زیادہ نمایاں اور باہم دگر برسرپیکار ہیں۔ لیکن اسلام مروجہ اصطلاحی معنوں میں نہ جمہوریت کو صحیح قرار دیتا ہے نہ ڈکٹیٹرشپ کو۔ کیونکہ جمہوریت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حق حکومت جمہور کو حاصل ہے جس کو وہ اپنے نمائندوں کے سپرد کرتے ہیں جس سے وہ نمائندے حکومت اور وضع قوانین کے مجاز ہو جاتے ہیں۔ اور ڈکٹیٹرشپ میں ڈکٹیٹر یعنے مختار مطلق کی ذات میں حق حکومت تسلیم کیا جاتا ہے اور اسلام تو کسی انسان یا کسی انسانی جماعت میں حکومت کا حق نہیں مانتا بلکہ حکومت کو صرف اللہ کا حق قرار دیتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۔

(نہیں ہے حکومت مگر اللہ کے لئے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کے بندے نہ بنو)

دوسری جگہ فرمایا ہے

لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا

(اللہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں گردانتا)

خود انبیاء کرام کو بھی یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ انسانوں کو اپنا غلام بنائیں بلکہ صرف یہ کہ ان کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق چلائیں۔ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ

(کسی شخص کو جسے اللہ کتاب حکم اور نبوۃ بخشے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بنو۔ بلکہ اللہ والے بنو۔ اس کے مطابق جو تم کتاب کو پڑھاتے اور پڑھتے ہو۔)

اس لئے ملت اسلامیہ کی مرکزی جماعت صرف قرآنی قوانین الٰہی کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے۔ اسی کی روشنی میں ہنگامی ضروریات کے لئے وہ ضوابط تیار کرے گی۔ اور کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکے گی جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔

(اور جو کوئی اللہ کے اتارے ہوئے (اصول) کے مطابق حکم نہ دے وہ ظالم ہے)

ان دو مرکزوں یعنے اللہ کی حکومت اور مرکز ملت کی اطاعت کے لئے تیسرا ایمانی اور اعتقادی مرکز امت اسلامیہ کا قرآن کریم ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی تعلیمات کسی ماحول کسی زمانہ کسی قوم اور کسی ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ

ابدی اور حقیقی ہیں جو ہر ماحول اور ہر زمانہ میں اٹل ہیں۔ کیونکہ یہ اس علیم و خبیر کی کتاب ہے جو زمانوں سے بالاتر ہے اور جسے خفائق کا علم رکھتا ہے۔ اس سے نصیحت ہر فرد مسلم لے سکتا ہے مگر اس کو اجتماعی طور پر استعمال کرنے کے لئے اس کی تشریح و توضیح اور اس کے اصول سے زمانہ کے اقتضا کے مطابق فروع کے اخذ کرنے کا حق صرف مرکزی جماعت ہی کو حاصل ہے بے شک قرآن ہر صاحب عقل کو دعوت دیتا ہے کہ آیات میں غور و فکر کرے۔ لیکن کسی کی کوئی تشریح اس وقت تک امت کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ مرکز اس کو تسلیم نہ کرلے۔ اسی طرح کوئی تلقین کوئی وعظ کوئی ارشاد یا رہنمائی امت کی بلا اجازت مرکز کے غلط قرار دی جائے گی۔ یہ بات اس موقع پر اجمالاً بیان کی گئی ورنہ اس کی مزید توضیح خود ایک جداگانہ مقالہ کی محتاج ہے۔

چوتھا مرکز اسلام کا مقامی ہے یعنے بیت اللہ جو توحید پرستوں کی پہلی مسجد ہے اور جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو موحدوں کے پیشوائے اعظم ہیں جنھوں نے بحکم الٰہی اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے اس گھر کو بنایا اس وقت جبکہ دنیا میں کوئی دوسری مسجد نہ تھی۔

اللہ نے اس گھر کو برکت عطا کی اور سرچشمۂ ہدایت بنایا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ۔

(پہلا (توحید کا) گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے وہ جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور دنیا جہان کے لئے ہدایت ہے)

جب یہ گھر تیار ہو گیا تو اللہ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ یہاں حج کے لئے آیا کریں۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ

(اور انسانوں میں حج کا اعلان کر دے۔ وہ تیرے پاس پاپیادہ اور لاغر سواریوں پر جو دور دراز آتی ہیں آئیں گے۔)

یہ اعلان کل انسانوں کے لئے کیا گیا جیسا کہ لفظ الناس سے ظاہر ہے لیکن مراد یہاں بنی نوع انسان کے موحدین ہیں کیونکہ اس گھر کی بنیاد توحید پر ہی ہے اور قرآن نے اس میں غیر موحدوں کا داخلہ بند کر دیا ہے۔

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا۔

(مشرک تو نجس ہیں اس سال کے بعد وہ مسجدوں کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔)

یہاں ضمناً یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی اسلام کے کہ روز اوّل سے وہی دین الٰہی ہے اور تمام انبیاء سابقین کے ذریعہ سے اسی دین کی تلقین دنیا کو کی گئی ہے اور یہی دین آخر میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

پر مکمل کیا گیا ہے جملہ انسانوں کو ایکساں قرار دیا ہے۔ اور نسل۔ رنگ۔ ملک یا زبان کے اختلاف سے ان میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ ہاں ایک تفریق وہ ضروری قرار دیتا ہے یعنے اسلام اور کفر جو لوگ عہد الست پر قائم ہیں اور انبیاء کے ذریعہ سے ملی ہوئی تعلیم کے تابع ان کو وہ اولیاء الرحمٰن کہتا ہے اور جو لوگ شرک یا کفر میں مبتلا ہیں ان کو اولیاء الشیطان یہ تفریق بلا امتیاز قوم و نسل قائم رہی ہے اور قیامت بلکہ جنت اور دوزخ تک رہے گی۔

الغرض کعبہ کو اللہ نے موحدوں کا بین الاقوامی مرکز قرار دیا۔ اور خاتم النبیین کے عہد میں اس مرکزیت کو مستحکم کرنے کے لئے جملہ ملت اسلامیہ کا قبلۂ نماز بھی اسی کو بنا دیا۔ آج حضرت ابراہیمؑ کے اعلان کو کم و بیش چار ہزار سال ہو گئے ہیں حج کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور سالانہ اس مرکز میں دنیا کے چاروں گوشوں سے موحد آکر جمع ہوتے ہیں۔ اللہ نے نہ صرف اس مکان کو بلکہ اس زمان کو بھی مرکزی حیثیت کے لحاظ سے احترام بخشا جس میں یہ اجتماع ہوتا ہے

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ

(اللہ نے کعبہ بیت اللہ کو انسانوں کے لئے دار و مدار قرار دیا نیز ماہ حرام کو قربانی کے جانوروں کو)

اس آیت میں کعبہ کی مرکزیت کی تصریح کی گئی کہ وہ موحدوں کی بین الاقوامی انجمن کا مرکز ہے۔ اور وہیں سے جملہ اجتماعی امور سرانجام پائیں گے۔ اور جس زمانہ میں یہ اجتماع ہوتا ہے اس زمانہ یعنے ذی قعدہ۔ ذی الحجہ اور محرم تینوں مہینوں کو محترم مہینہ قرار دیا جس میں ہر قسم کی لڑائی روک دی جائے گی تاکہ لوگ امن اور فارغ البالی سے اس اجتماع میں شریک ہو سکیں اس اجتماع کی غرض بھی اللہ نے صرف ایک مختصر جملہ میں بیان کر دی ہے۔ یعنے

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ ۔ تاکہ لوگ اپنے فائدوں کے لئے آن موجود ہوں

یہ فائدے کچھ انفرادی ثواب ہی تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ دینی۔ دنیاوی۔ ملکی۔ قومی۔ سیاسی۔ تجارتی علمی اور عقلی وغیرہ ہر قسم کے فائدے اس میں داخل ہیں۔ اور یہی رکن ہے جس سے ملت کی ہر قسم کی خرابیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے یہی مرکزیت باعث ہوئی کہ قرآن نے مسجد الحرام کے بین الاقوامی ہونے کا اعلان فرمایا۔

سَوَآءً نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۔ اس میں باشندے اور غیر باشندے یکساں ہیں

جس کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآنی بصیرت رکھنے والی جماعت نے جس میں حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ بھی شامل ہیں پورے شہر مکہ کو بین الاقوامی قرار دیا۔ اور وہاں کے کسی باشندے کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ کسی آفاقی اور باہر سے آنے والے حاجی کو اپنے گھر میں قیام سے روک سکے۔ بلکہ وہ مکہ کے گھروں میں کواڑ لگانے کو بھی پسند نہ کرتے تھے اور اگر کتوں وغیرہ سے تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔

اب اگرچہ اعتقادی طور پر یہ چاروں مرکزیتیں ملت اسلامیہ میں باقی ہیں لیکن سوائے کعبہ کی مرکزیت کے جس کی طرف مسلمان رخ کر کے نمازیں پڑھ لیتے ہیں اور سال میں حج کے لئے وہاں جمع ہو جاتے ہیں عملاً کوئی مرکز ان کا باقی نہیں رہا۔ الک عرش بریں کے ساتھ اب ہزاروں الک زمین پر اور حاجت روا زیر زمین مان لئے گئے ہیں جن کی زیارت اور پوجا ہوتی ہے۔ رسول کی جگہ ہر شخص لے لیتا ہے جو علماء کا لباس پہن کر لوگوں کی رہنمائی کے لئے کھڑا ہو جائے اور قرآن کے بجائے انسانی کتابیں دستور العمل بنی ہوئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب امت اسلامیہ کے افراد صرف انفرادی حیثیت سے مسلمان ہیں اور اجتماعی حیثیت کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے اب اجتماعی اسلام کے لئے ملت کا فریضہ یہ ہے کہ ان چاروں مرکزوں پر لوٹ کر آجائے یعنے اللہ کی اطاعت۔ مرکزی جماعت۔ قرآنی حکومت اور کعبہ کا بین الاقوامی سالانہ اجتماع ـــــ مجھے یقین ہے۔ کہ انشاء اللہ یہ ہو کر رہے گا۔

یہاں پر یہ سوال کیا گیا کہ اس اجتماعیت کے نئے سرے سے پیدا ہونے کی صورت کیا ہے؟

جواب میں کہا گیا کہ ہم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو مایوسی یا نادانی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مذہب ایک شخصی اور انفرادی چیز ہے اس کو اجتماعی ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن یہ خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دین جو سارے عالم کی اصلاح اور ہدایت اور دنیا میں سراسر امن قائم کرنے کے لئے آیا ہے وہ شخصی یا انفرادی کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے انفرادی اعمال سے مقصود تزکیۂ نفس اور اللہ کا تقویٰ ہے تاکہ افراد جماعت کا جزو صالح ہو سکیں اس لئے مذہب کے انفرادی ہونے کا خیال دین اسلام کے متعلق نہ صرف غلط بلکہ باطل ہے۔

دوسری جماعت ہم میں ایسی ہے جو یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ امام مہدی آن کر سب کچھ کر دیں گے۔ بعض لوگ امام مہدی کے تو نہیں قائل ہیں لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بلند شخصیت ایسی پیدا ہو گی جو اپنے شخصی وقار اور اقتدار سے ملت کو ایک مرکز پر لائے گی مگر نتیجہ ان دونوں باتوں کا ایک ہی ہے یعنی وہ خود کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ یہ خیالات اگرچہ بہت اطمینان اور تسلی کا باعث ہو سکتے ہیں مگر ان کی کوئی قرآنی سند نہیں ملتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ موجودہ انقلابات جو عجلت کے ساتھ اقوام دنیا پر آرہے ہیں ان میں ایک ایسا وقت آجائیگا کہ مسلمان جن خطوں میں آباد ہیں ان میں آزاد سیاسی جمہوریتیں قائم کر سکیں گے۔ اور پھر حج کے بین الاقوامی اجتماع سے کام لے کر وضع قوانین میں پوری ملت کو ہم آہنگ کرنے کے لئے وہ ساری جمہوریتیں اپنا ایک ملی مرکز قائم کریں گی جس کے لئے مکہ سے بہتر کوئی موزوں مقام نہیں ہو سکتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ اللہ کی مدد سے ملت ایک مرکز پر آسکے گی۔ میں اپنی قرآنی

بصیرت سے دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں میں خیر امت ہونے کے امکانات موجود ہیں اور باوجود ہزاروں خرابیوں کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان روحانی برکتوں سے نہ اب تک یہ اللہ کو بھولے ہیں اور نہ اللہ نے ان کو بھلایا ہے۔ صرف رجوع الی اللہ کی ضرورت ہے کہ نسیان نفس کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اپنے کو پہچان سکیں اور پھر سب مل کر ایک اور ایک ہی مالک کے بندے بن جائیں۔

اپنی آنکھ

اور

قرآن کریم کی روشنی

(پرویز)

کسی نئی زبان کے سیکھنے میں کس قدر محنت درکار ہوتی ہے! لیکن انسان کے بچہ کو دیکھئے کہ وہ ان دشوار گذار مراحل کو کس آسانی سے عبور کر لیتا ہے۔ بچہ جب بولنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس طرح بلا تکلف باتیں شروع کر دیتا ہے گویا یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد تھا۔ لیکن بچہ وہی زبان بولتا ہے جو اس کے گرد و پیش بولی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد نہ تھا بلکہ اس نے اپنے گہوارہ میں خاموش محاکموں سے سب کچھ سیکھ لیا تھا اور سیکھا اس پختگی سے کہ نہ صرف الفاظ ہی ازبر ہو گئے بلکہ اس لب و لہجہ کی بھی پوری پوری نقل کر لی جو اس کے ماحول کی فضا کو متحرک کر رہا تھا۔ اور نقل بھی ایسی مکمل کہ دو لفظ بولنے سے معلوم ہو جائے کہ بچہ کس خطہ اور کس قبیلے سے متعلق ہے۔ بڑی عمر میں پہنچکر جو زبان سیکھی جائے اس میں اہل زبان کا سا لب و لہجہ پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے اور ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ یہ پہچانا ہی نہ جا سکے کہ اس کی وہ زبان اداری ہے یا بعد میں سیکھی ہوئی۔ لیکن بچہ اس نقل کرنے میں کمال کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بچے کا ذہن کس قدر اخاذ ہوتا ہے اور وہ نقوش جو چپکے ہی چپکے اس کے لوح قلب و دماغ پر آغوش مادر میں منقش ہو جاتے ہیں کیسے ان مٹ اور دیرپا ہوتے ہیں لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچے کے دماغ کی یہ اخاذی اور اثر قبولی صرف زبان تک ہی محدود ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دماغ تو بہرحال دماغ ہے۔ جب وہ حروف و الفاظ اور لب و لہجہ کی حرکات و سکنات سے ایسا متاثر ہوتا ہے تو گرد و پیش کے دیگر احوال و کوائف سے اثر پذیر کیوں نہ ہوگا! زبان کی اثر پذیری چونکہ الفاظ کے محسوس پیکر میں ہمارے سامنے آجاتی ہے اس لئے ہم اسے ناپ لیتے ہیں لیکن خیالات کی اثر پذیری چونکہ بچے کے قلب و دماغ میں غیر محسوس طور پر پرورش پاتی ہے اس لئے ہم اس کا احساس نہیں کرتے۔ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ جنھوں نے کرنا چاہا انھوں نے ان غیر محسوس خیالات کو بھی ناپ اور تول کر دیکھ لیا۔ علم تجزیۂ نفس کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے۔ بہرحال ایک حقیقت ہے کہ انسان کا بچہ اپنے وراثتی اور احوالی اثرات کا پیکر ہوتا ہے۔ اور یہی نقوش و اثرات آہستہ آہستہ وہ محکم چٹانیں بن جاتے ہیں جن پر اس کے نظریات زندگی اور معتقدات حیات کی ثریا بوس عمارتیں قائم ہو جاتی ہیں۔

یہ اثرات جب توارث و تواتر سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آئیں تو ان کی ابتدا کتنی ہی غلط نہج پر کیوں نہ ہوئی ہو رفتہ رفتہ اس قوم کے نزدیک یہی صداقت و حقیقت کا معیار بن جاتے ہیں اس قوم کے فرد انتہائی خوش عقیدگی سے دل کے نازک ترین گوشوں میں چھپائے۔ سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور یہ غلط نظریات ان کے نزدیک ایسی گراں بہا متاع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ ان کا چھوڑنا تو ایک طرف۔ چھوڑنے کے تصور تک سے وہ اس طرح کانپ اٹھتے ہیں گویا ان کی کائنات لٹی جا رہی ہے۔ غلط نظریات و معتقدات کے حسین نظر فریب پردے اتنے دبیز ہوتے ہیں کہ فطرتِ صحیحہ ان کے نیچے دب جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا گلا اس طرح سے گھٹ جاتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہیں زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان پردوں کو کون اٹھائے! اس خاص ماحول میں تو کم و بیش ہر ایک ان وراثتی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ مبدأ فطرت کی کرم گستری نے یہ انتظام اپنے ذمہ لیا کہ وقتاً فوقتاً ایسے پیغامات اس کی طرف سے آتے رہیں جو وراثت و ماحول کے تمام اثرات سے محفوظ و غیر متاثر اور انسان کی فطرتِ صحیحہ کے عین مطابق و موافق ہوں۔ دنیا میں سلسلۂ وحی و رسالت کی یہی علم اور انتظام رشد و ہدایت کی یہی غائت ہے۔ یعنی انسان کی فطرتِ صحیحہ وراثت اور ماحول کے اثرات سے مسخ ہو جاتی ہے اور پیغامِ خداوندی ان غیر فطری اثرات کو دور کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ سعید روحیں فطرت سے ہم آہنگ پیغام کو جانی پہچانی ہوئی (معروف) آواز سمجھ کر اسے قبول کر لیتی ہیں۔ سرکش و متمرد انسان اپنے وراثتی معتقدات کو ایسا محکم اور یقینی خیال کر لیتا ہے کہ ان میں کسی قسم کے رد و بدل پر آمادہ نہیں ہوتا اور اسے ہزار دعوتِ غور و فکر دیجئے وہ اس پیغام کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔ حق و باطل۔ خیر و شر۔ کفر و اسلام کی یہی کشاکش ہے جو روزِ ازل سے اس وقت تک ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ سورۂ اعراف کے بائیسویں رکوع کو کھولئے اور دیکھئے کہ اس حقیقتِ کبریٰ کو کس بصیرت افروز انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ

اور جب تمہارے رب نے بنی آدم سے۔ یعنی اس ذریت سے جو ان کے ہیکل سے پیدا ہونے والی تھی۔ عہد لیا تھا اور انھیں (یعنی ان میں سے ہر ایک کو اس کی فطرت میں) خود اس پر گواہ ٹھہرایا تھا (عہد یہ لیا تھا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ ہاں تو ہی ہمارا رب ہے۔ ہم نے اس کی گواہی دی۔ اور یہ اس لئے کیا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ تم قیامت

کے دن عذر کر بیٹھو کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔

یعنی خدا کی ربوبیت کا اقرار خود فطرتِ انسانی کے اندر ودیعت کر کے رکھدیا گیا ہے اور انسان کی فطرت صالحہ کا تقاضا ہے کہ وہ دین کی اس صراطِ مستقیم پر رہے۔ اب اس سے اگلی آیت میں ہے کہ وراثتی اثرات انسان کو شرک کے غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔

او تقولوآ انما اشرك اباۤء من قبل وكنا ذريةً من بعدهم افتهلكنا بما فعل المبطلون ٥

یا تم یہ عذر کر بیٹھو کہ شرک ہم سے پہلے ہمارے آبا و اجداد نے کیا۔ ہم ان کی نسل میں بعد کو پیدا ہوئے اور (لاچار وہی چال چلے جس پر پہلوں کو چلتے پایا) پھر کیا تو ہمیں اس بات کے لئے ہلاک کرے گا جو ہم سے پہلے جھوٹی راہ چلنے والوں کی تھی! (۷/۱۷۳)

اس سے واضح ہے کہ فطرتِ صالحہ کا تقاضا کچھ اور ہے اور غلط روی کے آبائی اثرات اس فطرت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ احول و وراثت کے ان غیر فطری اثرات کو زائل کر کے فطرتِ صحیحہ کو بروئے کار لانے کا کیا طریق ہے؟ اس کے متعلق چار آیات بعد فرمایا کہ یہ صرف خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت کے اتباع سے ہو سکتا ہے۔

من يهد الله فهو المهتدى ۚ ومن يضلل فاولئك هم الخسرون ٥

جسے اللہ (اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) ہدایت دے وہی سیدھی راہ پر ہے۔ اور جس پر اس (قانون کے مطابق) راہ گم کر دے۔ تو یہ لوگ خسارے میں ہیں۔ (۷/۱۷۸)

لیکن وہ قانون کیا ہے جس کی رو سے خدا کے نازل کردہ پیغام سے ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے اور وہ روش کونسی ہے جس سے اس ہدایت سے مستفید نہیں ہوا جا سکتا؟ اس کی تشریح اگلی آیت میں فرما دی جس میں ارشاد فرمایا کہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے۔ ذہن و ادراک کی قوتوں کو کام میں لائے ڈھور ڈنگر کی طرح آنکھیں بند کر کے، جس ڈگر پر چلے آ رہے ہیں۔ اسی پر نہ چلتا جائے۔ اگر انسان نے فکر و نظر سے کام نہ لیا تو اس پر ہدایت کی روشنی گم ہو جائے گی۔ روشنی سے تو وہی مستنیر ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھول کر رکھے۔ آنکھیں بند کر کے، دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلنے والوں کا انجام جہنم ہے فرمایا۔

ولقد ذرأنا لجهنم كثيراً من الجن والانس لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم اذان لا يسمعون بها اولئك كالانعام بل هم

اضل ط اولٰئک ھم الغٰفلون ۰

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنھیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا (یعنی ان کا بالآخر ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے) یہ اس لئے کہ ان کے پاس عقل ہے لیکن اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے وہ (عقل و شعور کی قوتوں کو بیکار کر کے) چارپایوں کی مانند ہو گئے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو یکسر غفلت میں ڈوب گئے۔ $\frac{۹}{۱۷۹}$

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر حق و باطل کی کشمکش مسلسل ہوتی چلی آرہی ہے "یعنی فطرت صالحہ پر خارجی اور وراثتی اثرات غیر فطری پردے ڈال دیتے ہیں۔ اس پر پیغام خداوندی۔ جو ماحول وراثت کے تمام اثرات سے پاکیزہ و منزہ ہوتا ہے ان کے سامنے آتا ہے تقلیدی اثرات کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اس دعوت پر غور و فکر نہ کرے بلکہ ضد سے اسی روش پر جائے جس پر اس کے آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں اور جسے وہ وراثتی اور گرد و پیش کے خارجی اثرات کے ماتحت صحیح راہ سمجھ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ جہنم ہے اور ہلاکت جس دن سے خدا کا پیغام دنیا میں آنا شروع ہوا۔ اس دن سے آج تک جہل و بصیرت اور تقلید و تجدید کی یہ کشمکش جاری ہے۔ قرآن کریم میں امم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کر کے اس حقیقت ازلی کو بے نقاب کیا گیا ہے تاکہ آنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں چنانچہ مندرجہ صدر آیات میں مذکور ہے کہ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۰ ($\frac{۷}{۱۷۶}$)
سو اے پیغمبر یہ حکایتیں لوگوں سے بیان کرو تاکہ وہ ان میں غور و فکر کریں۔

قرآن کریم کے بیان کردہ امم سابقہ کے ان قصص و حکایات کو سامنے لائیے اور پھر ان پر غور کیجئے آپ دیکھیں گے کہ بار بار اسی حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ آبائی تقلید سے انسان فطرت کے صحیح راستہ سے ہٹ جاتے تھے۔ اس کے بعد حضرات انبیاء کرام علیہ کی وساطت سے آسمانی پیغام ان تک آتا۔ لیکن ان میں سے اکثر اس سے محض اس لئے اعراض برتتے کہ وہ پیغام ان کے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف ہوتا۔ حالانکہ اس پیغام کی دعوت سراسر عقل و بصیرت اور غور و تدبر پر مبنی ہوتی لیکن وہ لوگ غور و تفکر کے پاس نہ پھٹکتے اور جس راہ پر چلے آرہے تھے اسی پر چلے جانے میں عافیت سمجھتے۔ سب سے پہلے قوم حضرت نوحؑ کو لیجئے۔ ان تک پیغام خداوندی آیا۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۰ $\frac{۲۳}{۲۴}$ ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی۔

یعنی انکار کی وجہ یہ ہے کہ یہ دعوت ان کے اسلاف کی روش کے خلاف تھی اور انھوں نے اپنے بزرگوں سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی ۔

قوم نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ کی قوم کو لیجئے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ایک خدائے تنہا کی عبودیت اختیار کرو تو انھوں نے کہا کہ ۔

اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآءُنَا (۷۰)

کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی عبودیت اختیار کریں اور ان معبودوں کو

چھوڑ دیں جن کی عبودیت ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آئے ہیں

وہی ساز کہن کہ جس روش پر اسلاف چلتے آرہے ہیں اسے چھوڑ کر اس نئی روش کو کس طرح اختیار کر لیا جائے! یعنی اپنے مسلک کی تائید و صداقت میں کوئی دلیل نہیں کوئی برہان نہیں۔ بس دلیل ہے تو فقط اتنی کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ان کے آبا و اجداد چلتے آرہے ہیں۔

قوم ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کی قوم کو دیکھئے۔ قوم کو اس مرد صالحؑ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی روش پر چل کر ہماری پیشوائی کرے گا۔ لیکن جب اس نے حق و صداقت کی ایسی بات کہہ دی جو ان کے آبائی مسلک و طریق کے خلاف تھی۔ تو انھوں نے منہ پھیر لیا اور کہہ دیا کہ اف! کیسا افسوس کا مقام ہے۔ اس شخص سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں اور اس نے کس طرح ان سب کو خاک میں ملا دیا۔

قالوا یصٰلح قد کنت فینا مرجوًّا قبل ھذآ اتنھٰنا ان نعبد ما یعبد

اٰباؤنا وانّنا لفی شک مما تدعونآ الیہ مریب۞

انہوں نے کہا کہ اے صالح پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ

تھیں۔ پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ہم ان معبودوں کی عبودیت اختیار نہ کریں۔ جن کی عبادت ہمارے

آبا و اجداد کرتے چلے آرہے ہیں ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں نہیں آتی $\frac{11}{62}$

ایسا ہی جواب حضرت شعیبؑ کو اپنی قوم کی طرف سے ملا۔ انھوں نے قوم کو اس غلط راستے سے روکا جس پر وہ آبائی تقلید کی رو سے آنکھیں بند کر کے چلے آرہے تھے۔ تو قوم نے جواب دے دیا۔

قالوا لشعیب اصلوتک تامرک ان نترک ما یعبد اٰباؤنا و نفعل فی

اموالنا ما نشٰؤ اِنّکَ لَاَنتَ الحَلِیمُ الرَّشِیدُ ۞

قوم نے کہا کہ۔ اے شعیب۔ کیا تیری یہ نمازیں تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آکر کہے کہ ان معبودوں کو چھوڑ دو جن کی معبودیت تمہارے باپ دادا اختیار کرتے چلے آئے ہیں! یا یہ تمہیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو۔ کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو؟ ۱۱/۸۷

غور فرمائیے! اس جواب سے انکار و اعراض کی راہ اختیار کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح چھلک رہی ہے یعنی ہمارے آباؤ اجداد سب غلط راستے پر تھے اور یہی ایک راہ راست پر ہے؟ بڑا آیا کہیں سے تقدس مآب"؟ (معاذ اللہ) اسلاف کی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ان کے قلوب پر بزرگوں کی عظمت و عقیدت اس درجہ چھا جاتی ہے کہ وہ انھیں معصوم اور منزہ عن الخطا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اور اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ان کی روش کو غلط بتائے!

یہی کچھ فرعون کی قوم نے کہا۔ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ ان کے پاس خدا کی کھلی ہوئی نشانیاں لے کر گئے جن کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ تو بالآخر انھوں نے وہی جواب دیا جو اس سے پیشتر آبائی اثرات کے ماتحت ہر داعی الی الحق کو دیتا چلا آیا تھا۔ قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیہ اٰبآءنا وتکون لکما الکبریآء فی الارض وما نحن لکما بمؤمنین ۝

انھوں نے کہا! کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو۔ اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لئے سرداری ہو جائے ہم تو تمہاری بات ماننے کے نہیں! (۱۰/۷۸)

ملتِ حنیفہ کے مؤسس اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ نے بھی جب اپنی قوم کو اس غلط راہ سے روکا جس پر ان کے آباؤ اجداد چلتے آ رہے تھے تو انھیں بھی یہی جواب ملا کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ ۲۱/۵۳

انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا۔ وہ انہی کی پرستش کیا کرتے تھے!

غرضیکہ جہاں جہاں اور جب کبھی پیغامِ خداوندی اپنی روشن دلیلوں کے ساتھ پہنچا تو ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے آباؤ اجداد کے طور طریق پر چلے جانے میں ہی عافیت سمجھتے تھے اور ان کے ذہن میں یہ خیال جم چکا تھا کہ ان کے اسلاف کبھی غلطی نہ کر سکتے تھے۔ انھوں نے ہر جگہ اس پیغامِ حقیقت کی مخالفت کی۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم میں تمام اقوام سابقہ کے متعلق جامع طور پر فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی روش اختیار کی اور حضرات انبیاء کرامؑ سے یہی کہا کہ

سُیِدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا - ۱۴/۱۰
تم چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی عبودیت ہمارے آبا و اجداد اختیار کرتے چلے آئے ہیں۔ ان سے ہمیں روک دو۔

پھر جب ایسا ہوا کہ وہی نورِ آسمانی جو پہلے مختلف اقوام و ملل کے پاس قندیلوں کی شکل میں آتا رہا۔ ایک مہر عالمتاب بن کر چمکا۔ نو شپرہ چشم لوگوں نے حسب معمول یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم کبھی آنکھیں نہیں کھولیں گے اس لئے کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے دیکھا ہے۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝
بلکہ انھوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راہ پر چلتے دیکھا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلے جارہے ہیں۔ (۴۳/۲۲)

ایک دیدۂ بینا کے لئے یہ جواب یقیناً حیرت انگیز تھا کہ روشنی آجانے کے بعد اگر معلوم ہوجائے کہ جس راہ پر وراثتی قرأت کے ماتحت چلے جارہے ہیں وہ راہ ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جارہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسی راہ پر چلنے پر اصرار کرنا اور اس کے لئے دلیل یہ لانا کہ ہمارے آبا و اجداد اسی راہ پر چلا کرتے تھے۔ کھلی ہوئی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کے متعلق خود خالقِ فطرت نے بتایا کہ ان کی یہ روش کچھ انوکھی نہیں۔ بلکہ مسخ شدہ فطرت انسانی کا تقاضا ہی یہی ہے۔ جہاں جہاں روشنی آتی رہی۔ اسلاف کی تقلید میں آنکھیں بند کر رکھنے والے خفاشوں نے ہمیشہ اس کی طرف سے منہ موڑا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ
اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝
اور اسی طرح (اے رسولؐ) تجھ سے پہلے بھی جس بستی میں ہم نے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے تن آسان لوگوں نے یہی کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ قدم کی پیروی کریں گے۔ (۴۳/۲۳)

جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہ دلیل اتنی بودی اور یہ روش ایسی احمقانہ تھی کہ اس کی تردید کے لئے کسی بحث و تمحیص کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے جواب میں اتنا ہی کہا جاسکتا تھا کہ جس روش کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ مسلک خواہ تمہارے آبائی مسلک سے کتنا ہی بہتر اور محکم کیوں نہ ہو۔ کیا تم پھر بھی اسی روشِ کہن پر ہی چلے جاؤ گے! یعنی اگر اس دعوتِ جدید اور آبائی مسلک کو دلائل و براہین کے ترازو میں رکھکر تولنے کی کوشش کرو جب تو ہم بتائیں کہ

یہ دعوت کس قدر گراں بہا ہے۔ لیکن اگر دلیل فقط اتنی ہو کہ یہ روش چونکہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے سیدھی اور محکم ہے۔ تو اس کا کیا جواب؟

قالوا اولو جئتکم باھدیٰ مما وجدتم علیه اباؤکمؕ قالوا
انا بما ارسلتم به کفرون ۝

(اس پیغمبر نے) کہا کہ خواہ میں تمہارے پاس اس راہ سے جس پر تمہارے آباؤ اجداد چلتے تھے۔ کہیں زیادہ صحیح راہ لے کر آیا ہوں (تو کیا تم پھر بھی اس پرانی لکیر پر چلتے رہو گے؟) انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس دلیل و حجت تو ہے نہیں۔ لیکن) بات یہی ہے کہ ہم اس پیغام سے انکار کرتے ہیں جسے دیکر تم بھیجے گئے ہو۔ ۴۳/۲۴

یہی جواب سلسلۂ انبیائے کرام کی پہلی کڑیوں کی طرف سے دیا جاتا رہا اور یہی جواب اس مقدس سلسلہ کی آخری اور مکمل کردینے والی کڑی کی طرف سے دیا گیا۔ ۔۔

واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل الله قالوا بل نتبع ما الفینا علیه
اباؤنا ااولو کان اباؤھم لا یعقلون شیئًا ولا یھتدون ۝

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر تمہارے بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں (تو تم بھی عقل و ہدایت سے انکار کرتے رہو گے؟) ۲/۱۷۰

انسانی ضد اور جہالت۔ بےدانشی اور بے راہ روی۔ وراثتی اثرات کے ماتحت اسلاف کی اندھی تقلید کی یہ داستان ہمارے سامنے ہے جو انسان کی آنکھ کھولنے کے دن سے لیکر حضور خاتم النبیین صلعم کے عہد مبارک تک مذکور ہے۔ لیکن کیا اس کے بعد اس بے دانشی اور اسلاف کی کورانہ تقلید کا سلسلہ ختم ہوگیا؟ ختم کیسے ہوسکتا ہے! ابلیس نے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے سو جب تک ابنِ آدم دنیا میں موجود ہے ابلیسانہ حربے بھی اس کی راہ میں موجود رہیں گے۔ پہلی امتوں میں کیا ہوتا تھا؟ کچھ وقت تک وہ لوگ اپنے رسول کے لائے ہوئے پیغام کی اتباع کرتے۔ اس کے بعد جب نفسانی خواہشات ان پر غالب آجاتیں تو وہ رفتہ رفتہ دوسری شاہراہوں پر چل نکلتے۔ گمراہی کی یہ روش بالارادہ ہوتی۔ لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں غیر شعوری طور پر اپنے آبا و اجداد کے وراثتی اثرات کے ماتحت اس غیر فطری مسلک کو اختیار کئے جاتیں۔ اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا۔ اس لئے کہ ان

رگوں نے جہاں اپنے عمل کی راہ بدلی تھی اس کے ساتھ ہی پیغامِ خداوندی میں بھی تحریف والحاق شروع کر دیا تھا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ پیغام حوادثِ ارضی وسماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا۔ بہر حال وہ پیغام اپنی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس لئے ایک دوسرا رسول آتا اور تجدیدِ دعوت کرتا۔ نبی اکرمؐ کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے کہ خدا کا آخری پیغام اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گا۔ لیکن اس پیغام کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں کہ جس طرح پہلی قومیں راہ راست کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ وراثتی اثرات کے ماتحت غلط راستے پر چل نکلیں۔ یہ قوم غلط روش اختیار نہیں کرے گی۔ غلط روش اختیار کرنے کے لئے سینکڑوں محرکات اور ہزاروں اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اس روش سے حفاظت وضیانت کا تو ایک ہی طریق ہے کہ انسان اپنے ہر ایک قدم کا جائزہ پیغامِ خداوندی کی روشنی میں لیتا رہے اور جونہی کوئی قدم غلط طریق پر اٹھنے لگے۔ اسے فوراً قرآن کی صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان غلط راستے پر چلے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ فلاں فرقہ غلط راستے پر چلا اور فلاں صحیح روش پر گامزن رہا۔ لیکن بہر حال یہ واقعہ ہے کہ ایک فرقہ نہ سہی دوسرا سہی۔ غلط روش پر ضرور چلا اور چلے جا رہا ہے۔ ملتِ واحدہ کا فرقوں میں بٹ جانا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہر ایک صحیح روش پر نہیں رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ میں راہ راست پر ہوں اور دوسرے فرق غلط روش پر ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر پہلی امتوں میں سے کسی امت کی یہی حالت ہو جاتی جو ہماری ہو چکی ہے (اور آج سے نہیں ایک عرصہ سے ہو چکی ہے) اور ان کی اصلاح کے لئے کوئی رسول آتا اور خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کرتا۔ تو ان کی طرف سے کیا جواب ملتا! وہی جواب جو ملتا چلا آیا ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو، وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم تمہاری نہیں سنتے! اس کے جواب میں وہ داعی الی الحق لاکھ پیغامِ خداوندی کی روشنی کو پیش کرتا لیکن اس کا وہی جواب ملتا جو حضرت صالحؑ کی قوم نے دیا تھا کہ "ہاں ہمارے اسلاف سب غلطی پر تھے۔ بس تم ہی ایک راہ راست پر چلنے والے رہ گئے!" آج ہماری اصلاح کے لئے کوئی رسول نہیں آ سکتا لیکن جو روشنی رسولوں کی وساطت سے لا کرتی تھی۔ وہ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ اب دیکھئے کہ آج بھی جو شخص قرآن کریم کی آسمانی قندیل کو سامنے لا کر قوم کو بتاتا ہے کہ اللہ کی متعین کردہ صراطِ مستقیم کونسی ہے! اسے وہی جواب ملتا ہے یا نہیں جو پہلی قوموں کی طرف سے ملا کرتا تھا؟ یعنی یہ کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بھائی! میں تو کچھ نہیں کہتا۔ کہنے والی تو یہ خدا کی کتاب ہے! اس کا جواب کیا ملتا ہے؟ امسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت!! کہ لو بھائی! یہ آ گیا کہیں سے بڑا معتبر

بھلا ہمارے بڑے بوڑھے قرآن جانتے تھے؟ وہ کہتا ہے کہ بھائی! اس میں بحث و جدل اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں یہ ہے قرآن اور یہ ہے تمہاری روش۔ تم خود پرکھ کر دیکھ لو کہ یہ روش قرآن کے مطابق ہے یا نہیں! اس کا جواب کیا ملتا ہے؟ وہی پرانا جواب کہ ہمیں پرکھنے کی ضرورت نہیں ہمارے آبا و اجداد نے سب کچھ پرکھ لیا تھا! کہیئے کہ اس کا کیا جواب؟ اور اس تمام مباحثہ و مجادلہ کے پیچھے جذبہ محرکہ وہی ایمان ہے کہ ہمارے آبا و اجداد غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ معصوم اور منزہ عن الخطا تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے انسان کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگتی ہے اگر اس سے کہا جائے کہ تمہارے بزرگ غلطی بھی کر سکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت و ارادتمندی کے مقدس جذبات بھی وابستہ ہوں۔ ایسی مقدس ہستی اور غلطی؟ توبہ۔ توبہ۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن انھیں کون سمجھائے کہ معصوم صرف رسول کی ذات ہوتی ہے۔ باقی ہر انسان سے غلطی کا امکان ہے اور غلطی سے کسی انسان کے تقدس اور بزرگی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ ہم اپنے ہمعصروں میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔ ان غلطیوں پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ یہی ہمعصر آئندہ نسلوں کے اسلاف بن جائیں گے۔ اس لئے **اسلاف** میں غلطی کا امکان نہ ماننا! انھیں تنقید کی حد سے بالاتر سمجھ لینا کس دلیل کے ماتحت ہو سکتا ہے؟ محض یہ واقعہ کہ ایک شخص ہم سے سو برس پیشتر وفات پا چکا ہے۔ اسے منزہ عن الخطا نہیں بنا سکتا! اس کی تحقیقات کو قرآنی روشنی میں پرکھ لینے سے اس کی کسی قسم کی تحقیر و تذلیل نہیں ہو جاتی۔ ہر شخص کا فہم۔ ادراک، تحقیق اس کے ماحول اور زمانہ سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر زمانۂ مابعد کا انسان۔ اپنے کسی پیشرو کی تحقیق میں غلطی دیکھے تو درحقیقت اس سے اس پیشرو کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے جو محنت کی اور مشقت اٹھائی وہ ہمارے نزدیک درخور تحسین ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی محنت کا ماحصل تمام کا تمام وحیٔ منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھ لیا جائے۔ پھر یہ تنقید و تحقیق کسی شخص کی ذاتی رائے کے تابع نہیں ہوگی بلکہ قرآن کریم کے مطابق ہوگی۔ اگر زیر تنقید معاملہ قرآن کے مطابق ہو تو ہو المراد۔ اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ قرآن کریم کے مطابق نہ نکلا تو اس سے رجوع کر لینے میں کونسی خفت ہو جائیگی۔ قرآن کریم تو وہ نصابِ حیات ہے جس کی اتباع کا حکم خود ذات رسالتمآب کو بھی تھا۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۶/۱۰۶)

اے رسولؐ۔ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہے۔ تم اس کی پیروی کرو۔

اس لئے قرآن کریم کی اتباع میں اگر کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا اپنا خیال بھی ترک کر دینا پڑے تو اس میں

ذرا سا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ حق کو کبھی انسانوں کے ذاتی خیالات کے تابع نہیں ہونا چاہیئے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی شے اپنی اصل پر قائم نہیں رہنے پاتی۔ آج ہم جادۂ اعتدال سے اس لئے ہٹے ہوئے ہیں کہ ہم نے حق کو انسانوں کی آراء کے تابع رکھ چھوڑا ہے اور یہ سب وراثتی اثرات کے ماتحت غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے۔ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۞ (۲۳/۷۱)

اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے درہم برہم ہو جائے

دین خداوندی کے اکمل اور آخری ہونے کی تو دلیل ہی یہی ہے کہ حق ہر وقت اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اور یہی حق ہے جو ہر بات کے پرکھنے کا معیار ہے۔ اسی لئے اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے اندھی تقلید کی بناء پر نہیں۔ کورانہ تقلید میں بصیرت کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اور یہ عقل و بصیرت کو اپیل کرنے والی دعوت نہ صرف صاحب قرآن (صلعم) کا ہی خاصہ و امتیاز تھا بلکہ حضورؐ کے متبعین کی بھی یہی روشِ زندگی بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۞ (۱۲/۱۰۸)

(اے رسول) تم کہدو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی (بصیرت) کی بناء پر جو میرے سامنے ہے۔ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری اتباع کی ہے وہ بھی (اسی طرح حق کی طرف) دعوت دیتے ہیں۔

فرمایئے کہ جو نظریات و معتقدات وراثت و ماحول کے اثرات کے ماتحت۔ اسلاف کی بےجا عقیدتمندی کے تابع۔ اختیار کئے جائیں۔ ان کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت کیسے قرار دی جا سکتی ہے!

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے متعلق قرآنی تنبیہ و تندیر امم سابقہ کے متعلق۔ یا زیادہ سے زیادہ نبی اکرمؐ کے زمانہ کے منکرین کے متعلق ہے۔ ہم سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اقوام گذشتہ کے قصص و حکایات اور احوال و کوائف کا ذکر آیا ہی اس لئے ہے کہ آنے والے ان سے عبرت حاصل کریں۔ لیکن ہم ہیں کہ قدم بقدم امم سابقہ کے نقوش و آثار پر چلے جا رہے ہیں اور دل میں خوش ہیں کہ ہم بالکل صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ راستہ ہمارے اسلاف کا ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ اگر کسی راہ کی صداقت کے لئے اتنا ہی کافی ہو کہ وہ مسلک اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے تو آپ

اپنے زمانہ میں پیدا شدہ فرقوں کے علاوہ کسی اور فرقہ کی کسی روش کی بھی تکذیب نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ وہ کون سا مسلک و مشرب ہے جو بڑے بوڑھوں سے منتقل ہو کر آئندہ نسلوں کو نہیں ملا۔ لہٰذا حق و صواب کی راہ یہ نہیں کہ اس کے ساتھ اسلاف کے نقوشِ قدم کی سند ہو بلکہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب زندہ اس کی تائید کرے۔ جب قرآن کریم سامنے آجائے تو اس وقت کوئی چیز خواہ وہ تمہارے اپنے علم و عقل کی پیداوار ہو یا اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آرہی ہو کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس وقت حق و صداقت کا تقاضا ہے کہ خدائی سند کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے خواہ اس سے آپ کے اپنے علمی تقاضہ کو ٹھیس لگے یا اسلاف کی غلط عقیدتمندی پر حرف کیوں نہ آئے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو سورۂ لقمان میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو۔ تو وہ کہدیتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ کو دیکھا ہے۔ خواہ (اس روش کے مطابق) انھیں شیطان جہنم کے عذاب کی طرف ہی دعوت کیوں نہ دے رہا ہو (۳۱/۲۱)

یہ تو ان کی کیفیت ہے جو اسلاف کے نقوشِ قدم پر بلا سوچے سمجھے چلے جانے ہی میں نجات و سعادت کی راہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں صحیح مسلک کا بیان ہے۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۭ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝

اور میں نے اپنے آپ کو بخلوص قلب خدا کے پیغام کے سامنے جھکا دیا تو اس نے یقیناً ایک مضبوط شاخ کو پکڑ لیا اور انجام کار سب اللہ ہی کی طرف ہے۔ (۳۱/۲۲)

یعنی دین کا حکم نہ تو یہ ہے کہ تم اپنے خیالات کی ہی اتباع کرنے لگ جاؤ اور نہ یہ کہ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے بغیر دیکھنے پرکھنے کے اس پر گامزن ہوتے چلے جاؤ۔ دینِ قیم یہ ہے کہ اپنے خیالات اور اسلاف کی طرف سے منتقل ہونے والے معتقدات سب کو قرآن کریم کے ترازو میں رکھدو۔ جو وہاں سے پورا اترے وہ قابلِ تسلیم جس کا وہاں کچھ وزن نہ ہو۔ بلا تامل رد کر دینے کے قابل۔ یہ وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جسے شکست و ریخت کا کوئی خوف نہیں۔ یہ وہ منبع نور ہے جسے کسی رہزن کا خطر نہیں۔ وتلك الامثال نضربها للناس لعلهم يتفكرون۔

"وعظِ جدید"!

ہر مسلمان پر نماز پنجگانہ فرض ہے
تاکہ یہ باقاعدہ ورزش حیات انگیز ہو

غور سے دیکھیں تو روزے کا بھی مقصد یہی
تندرستی کا سبب یہ عادت پرہیز ہو

مدعا یہ ہے جو اہلِ زر پہ واجب ہے زکوٰۃ
ہر ادارے کا خزانہ نقد سے لبریز ہو

اس لئے حج کے سفر کا ہے مسلمانوں کو حکم
تاکہ ان کا جذبۂ سیر و سیاحت تیز ہو

رسمِ قربانی کا بھی در اصل یہ مقصود ہے
مردِ مومن جنگ میں سنگیں دل و خونریز ہو

جنّت و دوزخ سے ہے اک صورتِ امید و بیم
تاکہ یہ ذوقِ عمل کے واسطے مہمیز ہو

کوہکن ہیں ہم اُسی عقبےٰ کی جوئے شیر کے
جس سے دنیا ہی میں حاصل شوکتِ پرویز ہو

یوں نئے واعظ بیاں کرتے ہیں اسکی حکمتیں
دین جیسے اک دروغِ مصلحت آمیز ہو!

اسد ملتانی

نقد و نظر

میری زندگی (ایک پنچھڑی)

(انگریزی)

رئیس الاحرار محمد علی جوہر ایک شعلۂ درخشندہ تھا لیکن مستعجل۔ ابھرا۔ چمکا۔ اور گم ہوگیا۔ اور اس کے بعد متجسس نگاہوں کی حیرت اور متلاشی قلوب کی حسرت کے علاوہ اس کی کوئی یادگار بھی باقی نہ رہی۔ ڈھونڈنے والوں کو کچھ گری پڑی پتیاں ادھر ادھر ملیں۔ جن کا مجموعہ زیر نظر کتاب ہے۔ عنوان تو یہ ہے "میری زندگی" لیکن درحقیقت یہ ان کی کتاب زندگی کے چند پریشاں اوراق ہیں۔ ان اوراق کی ترتیب کا قصہ بھی عجیب ہے۔ عجیب لیکن درحقیقت جوہر کی فطری سیمابیت کی تھرکتی ہوئی مثال۔ مقدمہ کراچی میں سزایاب ہونے کے بعد قید کی تنہائیوں میں خیال پیدا ہوا کہ حضور رسالتمآب کی سیرت مقدسہ پر ایک کتاب لکھی جائے۔ قریب ایک سال کی کوشش کے بعد محسوس کیا کہ جیل کی فضا اس کے لئے سازگار نہیں۔ تو یہ ارادہ "اسلام۔ خدا کی بادشاہت" کے عنوان پر چار ضخیم جلدوں کی تصنیف کے خیال میں منتقل ہوگیا۔ ابھی ابتدائی مراحل بھی طے نہ ہونے پائے تھے کہ قید سے رہائی مل گئی۔ اور جتنا کچھ لکھا جا چکا تھا اس کے بعد اس پر کچھ اضافہ نہ ہو سکا۔ جو لکھا جا چکا تھا اسے مصنف کا ذاتی تعارف کہنا چاہیئے۔ نفس مضمون تک پہنچنے میں ابھی دیر تھی یہی "ذاتی تعارف" ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اور جسے جناب فضل اقبال صاحب (ایم۔ اے) نے ترتیب دیا اور شیخ محمد اشرف صاحب (تاجر کتب کشمیری بازار لاہور) نے انگریزی میں شائع کیا ہے۔ محمد علی (مدیر کامریڈ) کا قلم اردو بھی انگریزی زبان میں) پھر تصنیف بھی خود اپنے متعلق بے ربطگی اور عدم تسلسل کے باوجود۔ خون میں حرکت اور آنکھوں میں آنسو پیدا کر دیتے ہیں۔ کتاب پر تبصرہ گویا خود صاحب کتاب کی زندگی پر تبصرہ کرنا ہوگا جس کی نہ ضرورت ہے نہ محل۔ ترتیب میں بھی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن دیباچہ میں ایک ایسی چیز سامنے آگئی جو ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی عام افتاد طبیعت کی غماز ہے۔ ہمارے مغرب زدہ نوجوانوں کا عام رجحان یہ ہے کہ مثلاً وہ اگر علامہ اقبال کے فلسفہ پر قلم اٹھائیں گے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان کا فلاں خیال ہیگل سے ماخوذ ہے اور فلاں مسئلہ برگساں سے۔ فلاں نظریہ نیٹشے کا ہے اور فلاں مفہوم کانٹ کا۔ اور اس تمام سعی و کاوش سے مقصود فقط یہ بتانا ہوتا ہے کہ ہمیں مغرب کے اعلیٰ فلسفہ پر اس قدر عبور حاصل ہے۔

حکایتِ قدآں یارِ دلنواز کنم	باین فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

کتاب زیرِ نظر کا نام مصنف نے "اسلام۔ خدائی بادشاہت" تجویز کیا۔ اس پر جناب مرتب ارشاد فرماتے ہیں۔

"اس نام نے مجھے وہ الفاظ یاد دلائے جو شلر نے اپنی رنگین ایوی ہیں جرمن ہمعصروں سے کہے تھے۔ یعنی میرا خیال آنے سے پیشتر ہی تمام زمین تقسیم کر کے بانٹ دی جا چکی تھی۔ اور میرے لئے جو کچھ باقی بچا وہ فقط آسمان کی بادشاہت ہے ۔۔۔

لیکن محمد علی کے سامنے۔ شاعر ہونے کے باوجود۔ ایک جداگانہ نظریہ تھا۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ کتاب کے عنوان کے تعلق کونسا خارجی اثر کارفرما ہوا تو وہ ایچ۔ جی ویلز کا ناول "خدا۔ غیر مرئی بادشاہ" قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ مصنف نے یہ ناول غور سے پڑھا تھا۔ اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی اثر ان کی تصنیف کا جذبہ محرکہ ہو۔"

یعنی چونکہ مولانا محمد علی مرحوم نے ایچ۔ جی۔ ویلز کے ناول خدا۔ غیر مرئی بادشاہ۔ کا مطالعہ کیا تھا اور ان کی تصنیف کا عنوان بھی "اسلام۔ خدا کی بادشاہت" ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس خیال کا مآخذ ویلز کا ناول ہے! حالانکہ مصنف بچارا اپنی تصنیف کے ورق ورق پر بتاتا ہے کہ اسے قرآن سے کتنا عشق ہے۔ وہ اپنے بچپن ہی سے کس درجہ اس کتابِ زندہ کا گرویدہ تھا اور کس طرح اس کے مطالعہ نے اس پر "خدا کی بادشاہت" کی حقیقت واضح کی۔ لیکن ہمارے یہ نوجوان مرتب ہیں کہ انھیں "خدا کی بادشاہت" کا تصور ایک اجنبی خیال دکھائی دیتا ہے جس کی تخلیق کے لئے کبھی شلر کی شاعری کا رہین منت ہونا پڑتا ہے اور کبھی ویلز کی افسانہ طرازی کا۔ ہم ان حضرات کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کریں کہ۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم درکش	پریدہ رنگ ز باد صبا چہ می جوئی!

کتاب عمدہ طباعت اور کاغذ کے ساتھ پونے تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مجلّد اور اس پر گرد پوش۔ قیمت فی نسخہ پانچ روپیہ چار آنے (۵؎)

۲۔ مسٹر جناح کی تقریریں اور تحریریں (انگریزی)

ملّتِ اسلامیہ کے لٹے ہوئے قافلہ میں ایک نے نواز آیا اور کارواں کے دل میں احساسِ زیاں پیدا کر کے یہ کہکر چلا گیا کہ۔

پس از من شعرِ من خوانند و می یابند و می گویند	جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

یعنی اس کے جانے کے بعد وہ نہیں تو اس کی نے کی دلکش صدائیں اس کے کلام کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں لیکن اس نے جاتے وقت جس رہبر فرزانہ کے ہاتھ میں یہ شمع دی۔ وہ اپنا پیغام شعر کے پیکر میں پیش نہیں کرتا۔ اس لئے اس کے گراں قدر الفاظ اخبارات کے صفحوں پر دُرِ منتشرہ کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ بابائے شیخ محمد اشرف صاحب (تاجر کتب کشمیری بازار لاہور) کو اس ضرورت کا احساس ہوا اور انہوں نے جناب جناح کی۔ فروری ۱۹۳۵ء سے دسمبر ۱۹۴۱ء تک کی متفرق اور اہم تقریرات و تحریرات کو سلیقہ سے ترتیب دلا کر یکجا شائع کر دیا ہے۔ یہ فی الواقعہ ایسا کام ہے جس کے لئے ہم ناشر و مرتب کو مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک کا دور ملت اسلامیہ (ہندیہ) کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے اور جو انقلابات اس تھوڑے سے عرصہ میں آنکھوں کے سامنے آگئے ہیں۔ پہلے صدیوں میں بھی رونما نہ ہوا کرتے تھے۔ اس مختصر لیکن اہم دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کے باب میں جناب جناح نے جو عدیم المثال جدوجہد کی ہے اس کا صحیح اندازہ آنے والا مورخ ہی لگا سکے گا۔ اس لئے جناب جناح کی اس دور کی تقریریں اور تحریریں نہ صرف عام سیاسی مسائل پر صحیح تبصرہ ہی ہیں بلکہ مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کی ارتقائی داستان بھی ہیں۔ اس لئے ان کا مطالعہ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی نہایت ضروری ہے۔ ہم شیخ محمد اشرف صاحب سے گذارش کریں گے کہ وہ اب اس سلسلہ کو جاری رکھیں اور جناب جناح کی ہر سال کی تقریروں اور تحریروں کے مجموعے شائع کرتے جائیں۔ اگر ان کا کہیں اردو ترجمہ بھی شائع کیا جا سکے تو یہ بہت بڑی خدمت ہو۔ انگریزی نہ جاننے والے طبقہ کو صحیح اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ ان کا خدائے کشتی ملت کیا کہہ رہا اور کیا کر رہا ہے۔

طباعت کی خوبیوں کے لئے شیخ محمد اشرف صاحب کا نام کافی ضمانت ہے ۳۱۵ صفحات مجلد گرد پوش قیمت فی نسخہ چار روپیہ آٹھ آنہ ۔/۴/۸

۳۔ نور یہ ایک عجیب چیز ہے جو تبصرہ کے لئے ہمارے پیش نظر ہے۔ نہ کوئی تصنیف ہے نہ تالیف نہ کوئی پمفلٹ ہے نہ رسالہ۔ بلکہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے "اسلامیہ کالج فار ویمن" کی سکنڈ ایر کی ایک متعلمہ (سلیمہ اختر) کے وہ جوابات ہیں جو اس نے دینیات کے امتحانِ مقابلہ منعقدہ مارچ ۱۹۴۱ء میں دئے۔ جواب فی الواقعہ ایسے ہیں جن پر متعلمہ اس کے سرپرست حضرات اور خود کالج بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اسلام کی روح سے واقفیت اور پھر انداز بیان ایسا سلجھا ہوا۔ طالب علموں کی صف میں کم از کم ہماری نظروں سے تو اس سے پیشتر گذرا نہیں۔ یہ جوابات کالج کے اسلامک سٹڈی سرکل کی طرف سے شائع ہوئی ہیں اور عوام کی تشویق کی غرض سے غالباً مفت تقسیم کئے گئے ہیں۔

جمعیت العلماء

انسان کی نفسیاتی کیفیت بھی عجیب ہے۔ اصولاً کسی سے پوچھیے تو بلا تأمل کہدے گا کہ ہر شخص سے غلطی کا امکان ہے۔ لیکن بہت کم ایسے ملیں گے جو اپنی غلطی کا اعتراف کھلی پیشانی سے کرلیں۔ بالعموم ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی غلط بات کسی وقت کسی جذبہ یا خیال کے ماتحت منہ سے نکل جاتی ہے تو اس کے بعد وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسے صحیح تسلیم کرادے۔ اس سعی لاحاصل میں اس سے فریب خوردگی اور فریب دہی کے ایسے ایسے مظاہرے ہوتے ہیں کہ جس پر ساری دنیا ہنستی ہے لیکن اس سے اسے اور چڑھ پیدا ہوجاتی ہے۔ اور ساری دنیا کے خلاف اس کے دل میں انتقام کی آگ شعلہ زن ہوجاتی ہے کچھ وقت کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ یا تو قلب میں سکون پیدا ہوجانے کی وجہ سے یا خارجی احوال و ظروف کی بناء پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوجاتا ہے۔ انسانی زندگی میں آزمائش کی یہ گھڑی بڑی نازک اور کٹھن ہوتی ہے۔ غلطی کے اعتراف میں اپنی خودی کے (غلط تصور) کو ٹھیس لگتی ہے جس شد و مد سے اپنے غلط خیال کو صحیح ثابت کرنے میں تگ و دو کی تھی وہ تمام مراحل ایک ایک کرکے سامنے آجاتے ہیں۔ پھر نام کی شہرت۔ معتقدین کا خیال۔ گردوپیش کے کنکھیوں کے اشارے یہ تمام تصورات جمع ہوکر اعتراف حقیقت میں گلوگیر ہوجاتے ہیں۔ ایسے وقت میں اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہوجائے تو انسان ان تمام ذہنی موانع کو جھٹک کر الگ کردیتا ہے اور نہایت کشادہ دلی اور وسیع النظری سے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ دیکھتا ہے کہ جھوٹی عزت کا زعم باطل جو اعترافِ حقیقت میں یوں عنا گیر ہو رہا تھا اس کی اصل۔ اس کے اپنے دماغ کے بتکدہ سے باہر کہیں کچھ بھی نہ تھی۔ لیکن اگر اس کشمکش کے عالم میں یہی باطل تصورات انسان کے قلب و دماغ پر چھا جائیں تو وہ کبھی اعترافِ حقیقت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی غلط روش پر پہلے سے بھی زیادہ شدت سے کاربند رہتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ راہ اسے ہلاکت و بربادی کے مہیب غار میں دھکیل دیتی ہے۔

ارباب نظر دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے علماء کرام کی جماعت آجکل ایسی ہی نفسیاتی کشمکش میں گرفتار ہے۔ اور اس کی کھلی ہوئی دلیل جناب حسین احمد صاحب مدنی کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے جمعیت کے گذشتہ اجلاس (لاہور) میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں علاوہ اس پریشانی تحریر کے جو صاحب تحریر کی قلبی کیفیت کی غماز ہے۔ خیالات کا تضاد اس دوراہے کی طرف صاف صاف اشارہ کررہا ہے جہاں پہنچکر انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

ہندوستان کا وہ کونسا مسلمان ہے جسے ۱۹۳۸ء کا وہ تاسف انگیز واقعہ نہ یاد ہوگا جب جناب مدنی نے یہ ارشاد فرما کر کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں" اسلام سے پیشتر عہد جاہلیت کے بوسیدہ افسانہ کہن کی پھر سے یاد تازہ کر دی تھی اور یہ بھی کسے نہ یاد ہوگا کہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال مرحوم نے انھیں کس طرح اپنے مخصوص انداز میں اس پر متنبہ فرمایا تھا لیکن قوم کی بدبختی کہ بجائے اس کے کہ جناب مدنی اس تنبیہ سے اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے۔ انھوں نے عناد اور کد کی راہ اختیار فرمالی اور اس تین چار سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی بہت سی کوششیں جو اپنی تعمیر میں صرف ہونی تھیں۔ ان کی اس غلط روش سے پھیلنے والے زہر کے ازالہ میں ضائع ہو گئیں لیکن ہمیں خوشی ہوئی کہ واقعات نے جناب مدنی کو ان کی غلطی کے احساس پر مجبور کر دیا اور انھوں نے بالآخر محسوس کر لیا کہ فی الواقعہ قومیں اوطان سے نہیں بنتیں بلکہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے جداگانہ تصور حیات (یعنی دینی اساس) کی بناء پر ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا ہے۔

ہندوستان کے داخلی مسائل میں مسلمانوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے گذشتہ ایک صدی سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمت عملی نے مسلمانوں کو بھی ہندوستان کی اقلیتوں میں داخل کر کے ان کے متعلقہ مسائل کو اقلیتوں کے مسائل سے وابستہ کر دیا ہے۔ برطانوی سیاسیین اور مدبرین ہمیشہ مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت کی صف میں شمار کرنے اور ان کے معاملے کو اقلیتوں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اسی بناء پر ہندوستان کی غیر مسلم قومیں بھی ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے متعلقہ مسائل کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہیں جو اقلیتوں کے مسائل کے ساتھ کرنے والی ہیں یہ خیال انگریزوں اور غیر مسلموں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت ہیں اور اس وجہ سے وہ تمام اندیشے اور وسوسے اور خطرات ان کے دلوں پر چھا گئے جو ایک اقلیت کو اپنی زندگی اور انفرادیت کے متعلق اکثریت کی طرف سے پیش آتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی مردم شماری میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان بھی عددی اقلیت میں ہیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ بجائے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد یورپ کے کسی بڑے سے بڑے خطے کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے نیز ہندوستان کی تعمیر میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے ہندوستان میں ان کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم

خصوصیات کے مالک ہیں جغرافیائی حیثیت سے انھیں قدرتی استحکام حاصل ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں وہ اکثریت رکھتے ہیں اور اگر صوبوں کی از سر نو تحدید اور توسیع کی جائے تو وہ تیرہ مجوزہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کرلیں گے ان تمام حالات میں بھی اگر مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت قرار دے کر دیگر اقلیتوں میں انھیں شامل کردیا جائے تو اس سے زیادہ سیاسی غلطی اور کیا ہوسکتی ہے اور اس سے بڑا اور کیا فریب دنیا کو دیا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں یونہی جناب مدنی کے منہ سے ایک بات نکل گئی جس کی رَو میں وہ اڑ گئے۔ ورنہ وہ تو اس سے بہت پہلے (۱۹۲۸ء) میں بھی اس حقیقت کے قائل تھے کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت نہیں بنائی جاسکتی۔ چنانچہ جناب مدنی نے ۱۹۲۸ء میں جناب شوکت علی صاحب (مرحوم) کے نام اپنی ایک چٹھی میں تحریر فرمایا تھا۔

"چونکہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے۔ اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرما رہے ہیں کہ یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی فرقہ کی زمین نہیں ہے یہاں جو راج قائم ہوگا وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے" جو مظالم آئے دن دفتروں میں شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جا رہے ہیں اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب ہندو دیوتا گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت کی توقع نہیں کرسکتے۔"

یہ الگ بات ہے کہ جناب مدنی ہندوؤں کی تنگ نظری اور شقاوت قلبی کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان سے متحدہ قومیت کی توقع نہیں رکھی جاسکتی اور حضرت علامہ اقبال نے اپنی بصیرت قرآنی سے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا تھا کہ کفر اور اسلام (یعنی مسلم و غیر مسلم) کے امتزاج سے کبھی ایک قوم بن ہی نہیں سکتی۔ ایسا تصور یکسر غیر اسلامی (یعنی عجمی) ہے۔ بہر حال ہمیں خوشی ہوئی کہ جناب مدنی نے اب حقیقت کا احساس فرمالیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک قوم کی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک اب دوسرا مسئلہ لیجیے۔ ۱۹۳۸ء میں جناب مدنی نے ارشاد فرمایا تھا۔

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو مسلمان سکھ۔ عیسائی۔ پارسی سب شامل ہوں۔ حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیے ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق

ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے" (زمزم ۔ ۱۲ جولائی ۱۹۳۸ء)

یعنی جناب مدنی کے نزدیک ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی۔ پارسی۔ (مسلم وغیر مسلم) کی مشترکہ حکومت مغربی انداز جمہوریت کی بنا پر اسلام کے اصول کے عین مطابق تھی حضرت علامہؒ نے اس پر بھی تنبیہ فرمائی تھی اور کہا تھا کہ اسلام خود ایک نظام حکومت ہے جس میں قانون سازی کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اس لئے مسلم وغیر مسلم کی مشترکہ حکومت کسی صورت میں بھی اسلام میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔ باقی رہی مغربی جمہوریت۔ سو وہ انسانیت کے لئے لعنت اور درحقیقت نقاب پوش استبداد ہے۔ جناب مدنی نے اس کی بھی بڑی شدت سے مخالفت کی اور ارباب ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ اس مخالفت میں انھوں نے کیا کیا کہہ ڈالا۔ وہ ۱۹۳۸ء تھا اب دیکھئے کہ ۱۹۴۲ء میں آپ کا کیا خیال ہے۔ جمہوریت کے متعلق ارشاد ہے۔

> شخصی حکومتوں اور ملوکانہ جبر و استبداد اور حاکمانہ خود غرضیوں اور شہوت پرستیوں وغیرہ کی وجہ سے عالم انسانی پر جو جو بربادی اور ہلاکت کے پہاڑ ٹوٹا کرتے تھے اس سے تنگ آکر انسانی دنیا نے انقلابات کے دروازے کھولے اور جگہ جگہ جمہوری نظام جاری کیا گیا۔ اگرچہ بعض ممالک میں شاہی خاندانوں کو بھی باقی رکھا گیا۔ مگر ان کو اس قدر بے دست و پا کر دیا گیا تھا کہ نظم ونسق اور عام رعایا کے متعلق کسی قسم کے تصرف کا اختیار باقی نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ جمہوری نظام اگرچہ ظاہری نظر میں عام انسانوں کے لئے خوشکن تھا اور ممکن تھا کہ ابتدائی مراحل میں اس میں پوری طرح ہر عام وخاص غریب وامیر کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو مگر اقتدار کے قائم ہوتے ہی بوالہوسی اور سرمایہ پرستی کا غلبہ ہو گیا غرباء اور مزدوروں کے خون و پسینہ سے ہولی کھیلی جانے لگی۔ نظام میں اس قدر سرمایہ پرستی خود غرضی اور یورپین قومیت کی لعنت گھس گئی کہ عام انسانی دنیا شخصی حکومتوں سے اس قدر ہلاکت اور بربادی کا شکار نہیں ہوئی جتنی کہ اس فریبانہ جمہوریت اور نام نہاد خدمت خلق سے ہونے لگی بالآخر عالم انسانی میں دوبارہ انقلاب کا نشو و نما ہوا اس غلط اور برباد کن جمہوریت کے نظام کو توڑنے اور اس کو مٹا دینے کے ولولے ظہور پذیر ہوئے۔

یعنی وہی جو ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہؒ نے ارشاد فرمایا تھا۔ لیکن جناب مدنی کا سینہ احساس غلط روی اور اعتراف حقیقت کی جس کشمکش کی آماجگاہ بن رہا ہے اس کا مظاہرہ اس تضاد سے ہوتا ہے جو چند ہی صفحات کے بعد ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اپنے خطبہ کے صفحہ ۲۶ پر اٹلانٹک کے نوشتہ کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

کہ جب مسٹر چرچل نے اعلان کیا تھا کہ جنگ کے بعد کمزور قوموں کو آزادی دی جائے گی تو

ہندوستان کی مردہ امیدوں میں پھر زندگی کی ایک لہر پیدا ہوئی اور یہ خیال کیا گیا کہ جنگ کے بعد دنیا میں زندگی۔ آزادی اور جمہوریت کا جو نیا نظام قائم کیا جائے گا ہندوستان بھی اس نظام میں اپنا باعزت مقام حاصل کرے گا"

یعنی ابھی ابھی مغربی جمہوریت کو انسانیت کی نعمت بتایا جا رہا تھا اور ایک ہی سانس کے بعد ارشاد ہے کہ اس احساس سے کہ جنگ کے بعد ہندوستان جمہوریت کے نئے نظام میں باعزت مقام حاصل کرے گا ہندوستان کی مردہ امیدوں میں زندگی کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔

اب دوسری شق لیجیے۔ یعنی کیا مسلم و غیر مسلم کی مشترکہ حکومت کا تصور اسلامی ہو سکتا ہے! جناب مدنی صاحب کا ۱۹۳۸ء کا ارشاد ہم پہلے نقل کر چکے ہیں اب حکومت کے بارے میں آپ کا ۱۹۳۸ء کا خیال ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہے۔

اس لئے اگر خالق الکل رب العلمین کا بنایا ہوا انسانی نظام ہی ہر خاص و عام اور ہر فرد و جماعت کے لئے مفید اور کارآمد اور انتہائی منفعت کا کفیل ہو سکتا ہے نہ کہ انسانوں کا خود ساختہ نظام۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

ان اصول نے صاف طور پر یہ بھی روشن کر دیا ہے کہ کوئی امیر اور سلطان نہ مطلق العنان ہے اور نہ صرف اپنے خاندان یا کسی پارٹی کا نمائندہ ہے اور نہ کسی استبدادی آمریت کا مالک ہے بلکہ وہ خداوند کریم کا نائب اور خدائی قانون کو نافذ کرنے والا حاکم ہے اور اسی کے قانون کے ماتحت جوابدہ اور مسئول ہے۔

پھر ارشاد ہے۔

بہر حال آج ہم تمام دنیائے انسانی کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر وہ امن عام اور کارآمد ترقی اور حقیقی رفاہیت اور خوشحالی چاہتے ہیں تو صرف اسلامی نظام میں ہی پا سکتے ہیں۔ بالشویزم یا نازی ازم یا یورپین نیشنلزم ڈیموکریسی، یا اور کوئی نظام جو کہ انسانی عقل و دماغ کا اختراع کیا ہوا ہے ہرگز اس کی کفالت نہیں کر سکتا نہ اس رب العلمین کے حقوق کی کفالت ہے نہ مخلوقات اور اقوام و افراد انسانی کے حقوق کی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ جب اسلامی نظامِ حکومت وہ ہے جس کی تصریح ارشادات بالا میں کی گئی ہے تو پھر حضرات علماء کرام نے اپنا موجودہ مسلک۔ جس میں کفر اسلام کے امتزاج سے خالص انسانی حکومت۔ اور وہ بھی مغربی انداز جمہوریت کی۔ قائم کرنا مطمح نگاہ ہے کیوں اختیار فرمایا؟ اس کے متعلق ارشاد ہے۔

آپ کو تاریخ کے صفحات دیکھنے بالخصوص علمائے ہند کی شاندار ماضی کے دیکھنے سے پتہ چل جائے گا کہ علماء ہند نے ہمیشہ سے اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کوشش کی ہے (حالانکہ شاندار ماضی میں ان کی جدوجہد کے سمندر میں سے چند قطرے ہی دکھائے گئے ہیں) مگر وائے بدقسمتی کہ باوجود انتہائی جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے اصل مقصد حاصل نہ ہو سکا، تب موجودہ احوال اور گردوپیش کی انتہائی مشکلات جو کہ داخلی اور خارجی بیحد و بے شمار ہیں ضروری معلوم ہوا کہ اہون البلیتین کو اختیار کیا جائے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے مشترکہ جدوجہد میں حصہ لیا جائے۔ اہون البلیتین کو اختیار کرنا شرعی اصول ہے اور ہر زمانہ میں معمول بہ رہا ہے۔ اور اگرچہ مشترکہ جدوجہد سے حاصل ہونے والی آزادی نظام اسلامی نہ کہلا سکے گی تاہم بہت سی مشکلات اور سخت موانع کے رفع ہو جانے سے حقیقی نصب العین کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

یعنی حضرات علماء کرام کا ہندوؤں کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینا "دو مصیبتوں میں سے کمتر درجہ کی مصیبت اختیار کر لینے" کے شرعی اصول کے مطابق ہے۔ بہت اچھا! لیکن ذرا یہ بھی سنئے کہ ۱۹۲۰ء میں جناب مدنی کا اس قسم کی آزادی کے متعلق کیا خیال تھا۔ آپ نے جناب شوکت علی صاحب (مرحوم) کے محولہ بالا چٹھی کے دوران میں تحریر فرمایا تھا۔

"میں آنجناب کی توجہ ایک خاص طریقہ پر اور ایک حقیقت نفس الامری کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آزادی کامل ہمارا مذہبی۔ سیاسی۔ اور وطنی نصب العین ہے۔ اور ہر حیثیت سے ہم کو اس کی کوشش کرنی چاہیئے مگر اس کے ساتھ ہم اپنے مذہب اور قوم کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ آزادی کو بھی مذہب اور قوم کی وجہ سے ڈھونڈتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مذہب برباد ہو جائے اور مسلمان فنا ہو جائیں تو ایسی آزادی سے کیا فائدہ ہے"

یعنی خود جناب مدنی صاحب کے نزدیک وہ آزادی جس میں مسلمانوں کا مذہب اور قوم باقی نہ رہے مسلمان کے نزدیک قطعاً قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ایسی تحریک میں شمولیت اور تعاون یکسر غیر اسلامی ہوگا۔

یہ چیز کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد۔ ملک کی متحدہ قومیت کے جمہوری نظام حکومت میں مسلمانوں کے مذہب اور قوم کی کیا حالت ہوگی! اب کسی تشریح کی محتاج نہیں رہی۔ اس آنے والی آزاد حکومت کے ارباب حل وعقد کھلے کھلے الفاظ میں بتا چکے ہیں کہ

"اب یہ ناممکن ہوگا کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں۔ اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھا جائے اور انھیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم ہوسکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت کی بنا اس نظریے پر قائم ہوسکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہوکر ایک متحدہ قومیت بن جائیں"

(ہندوستان ٹائمز مورخہ ۹/۵/۴۸)

یہ اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر ڈیسائی کے ارشادات ہیں۔ اس ضمن میں پنڈت نہرو کے ارادے بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں یا دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہوگیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اُسے یکسر مٹا دینے تک کی آرزو کی ہے۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بیجا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقاء کا حامی ہے"۔ (میری کہانی ص۱۱۱)

مسلم قومیت کے متعلق بھی سن لیجئے۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں منتشر ہے مبہم ہے۔ اور غیر متعین ہے اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ

بہت دور از کار ہے ..... مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے" (میری کہانی جلد دوم صلا۳۳)

پھر فرماتے ہیں۔

مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا"

کس قدر تاسف سے لکھتے ہیں :۔

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں، گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں"

اب اس کے بعد خود ہی اندازہ فرمائیے کہ یہ دلیل کہ علماء کرام نے "متحدہ قومیت" اور "مشترکہ حکومت" کا مسلک اہون البلیتین کے شرعی اصول کے ماتحت اختیار فرمایا تھا کس قدر کمزور اور سست بنیاد ہے۔

اب اس مقام پر پہونچے جہاں اس "دوراہے" کی کشمکش اور بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ جدوجہد کے مطامح نگاہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

آئندہ آزاد ہندوستان میں برطانیہ نے اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کی غرض سے مسلمانوں کے لئے کونسا سیاسی مقام تجویز کیا ہے؟ میں اس وقت اس بحث کو چھیڑ کر تلخیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا لیکن خود ہندوستان کے سیاسی مفکرین کے سیاسی تصورات کا جہاں تک تعلق ہے انھیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو ہندوستان کے آئندہ آئین حکومت کی تشکیل اس طریق پر کرنا چاہتا ہے کہ فرقہ وارانہ اکثریت کی ایسی مستحکم مرکزی حکومت قائم ہو کہ مسلمانوں کو تمام ہندوستان میں ایک اقلیت کی جگہ ملے اور ان کی زندگی اور بقاء تمام تر ایک طاقتور اور ناقابل تسخیر اکثریت کی مرضی سے وابستہ ہو لیکن یہ تصور محض ایک پریشان خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا یہ تصور اندھی سیاست ہونے کے علاوہ صائب الرائے مفکرین کے نزدیک ناقابل عمل بھی ہے اس تصور کو جس قدر جلد دماغوں سے محو کر دیا جائے اسی قدر ہندوستان کے مجموعی مفاد کے لئے بہتر اور ہندوستانیوں کے لئے

مفید ہوگا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو پہلے گروہ کے تصور اور اس کے عواقب و نتائج سے گھبرا کر مسلمانوں کی نجات اور خوش عیشی کیلئے صرف یہ راستہ تجویز کرتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے اپنا جداگانہ سیاسی منطقہ بنا کر براہ راست تاج برطانیہ کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کردے اس گروہ نے اپنے تقسیم ہند کے مطالبہ کو نہایت بلند آہنگی اور شدت کے ساتھ منظر پر لانا شروع کر دیا ہے لیکن اس کے کسی پہلو پر ہلکی سی روشنی بھی نہیں ڈالی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی ان کے مذہبی مقدس شعائر، مساجد، مزارات علمی ادارے، اوقاف وغیرہ اس قدر کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ مسلمان کسی حالت میں ان کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور تقسیم ہند کی صورت میں ان کا حشر کیا ہوگا اس پر مجوزین تقسیم بالکل خاموش ہیں اس لئے جب تک یہ نظریہ پوری تفصیل کے ساتھ روشنی میں نہ آئے اس وقت تک اس پر کوئی بحث بے سود اور بے نتیجہ ہے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مجوزین تقسیم کے نزدیک بھی اسلامی منطقہ میں قائم ہونے والی حکومت کا دستور اساسی اسلامی اور الٰہی حکومت کا دستور نہ ہوگا اس کی بنیاد بھی یورپین طرز حکومت پر ہوگی اور اپنے تحفظ کے اطمینان ہو جانے پر اسے قبول کرنے میں بھی وہی اہون البلیتین اختیار کرنے کا اصول برتنا ہوگا نیز اس نظریہ کے ماتحت ہندو منطقے اور مسلم منطقے قائم ہو جانے کی صورت میں ہندو منطقوں میں مسلمان جن کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ ۱۴ فی صدی اور اکثری طور سات یا پانچ فی صدی ہوگی بالکل بے دست و پا اور زندہ درگور ہو جائیں گے اور مسلم منطقوں میں غیر مسلم جن کی تعداد ۴۵ فیصدی تک ہوگی مسلم حکومت کے لئے وبالِ جان ہوں گے۔

"پس مسلم منطقے ہندو منطقوں کے تقریباً ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی تباہی اور ہلاکت کی دستاویز پر خود دستخط کر کے اور اپنی جگہ ایسی حکومت جس میں غیر مسلم متعصب مؤثر اقلیتیں ان کے لئے وبالِ جان ہوں حاصل کر کے کون سی فلاح و بہبود اور اطمینان و مسرت حاصل کر سکیں گے۔ کیا یہ غضب کچھ کم ہے کہ مسلم اقلیتوں کے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے جو کام کیا گیا ہو وہ ایسے طرز پر کیا جائے کہ انہیں غریب بے کس مسلمانوں کی ساڑھے تین کروڑ کی تعداد ہلاک و برباد کر دی جائے

اور اپنی اکثریت بھی شدید خطرات میں مبتلا ہو جائے۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو ہندوستان کے آئندہ آئین کو وفاقی، لامرکزی اصول پر مرتب کرنا ہندوستان کے لیے اور اس کے تمام صوبوں اور قوموں کے لیے مفید اور قابلِ عمل سمجھتا ہے۔ وفاق میں شامل ہونے والی حکومتیں اپنی اپنی جگہ کلیتاً آزاد اور خود مختار ہوں گی۔ مرکزی حکومت، ان کی آزادی میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ مرکز کو صرف وہ اختیارات ملیں گے جو وفاق کے اجزا اس کو اتفاق رائے سے سپرد کریں گے اور غیر معرحہ اختیارات صوبائی حکومتوں کو حاصل رہیں گے۔ ہر حکومت میں اقلیتوں کے تہذیبی۔ سیاسی۔ مذہبی حقوق کی حفاظت کی جائیگی اور ان کی صوابدید کے موافق تحفظات دیئے جائیں گے۔ اکثریت اپنے حقوقِ اکثریت سے مستفید ہوگی اور اقلیتیں امن و اطمینان کی زندگی بسر کریں گی۔ غیر مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت کو کسی تکلیف اور بے انصافی کا خوف نہ ہوگا۔ ان کے تمام سیاسی اور مذہبی حقوق اور مقدس شعائر بجائے خود محفوظ ہو جائیں گے۔ اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلم اقلیتیں امن و اطمینان سے زندگی بسر کریں گی۔ اور ان کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ کی جائے گی۔ اور ان کے تمام سیاسی اور مذہبی حقوق اور شعائر محفوظ ہو جائیں گے۔ ہندوستان کے ذی بصیرت اصحاب، رائے اس تجویز کو موجودہ ماحول میں قابلِ عمل اور ہندوستان کے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے کا واحد راستہ سمجھتے ہیں۔"

آپ نے غور فرمایا کہ جناب مدنی کس طرح دو راہے کے بیچوں کے بیچ کھڑے ہیں۔ ایک طرف ہندوؤں کا مطالبہ کہ تمام ہندوستان کا مرکز ایک ہو۔ اور مستحکم ہو۔ دوسری طرف مسلمانوں کا مطالبہ کہ وحدتِ مرکز مسلمانوں کی غلامی کا استمراری پٹہ ہے۔ اس لئے مرکز بالکل اڑا دیا جائے اور ان دونوں کے درمیان ہمارے علمائے کرام کا یہ مطالبہ کہ مرکز رہے لیکن کمزور سا رہے ؎

پیمانہ اس کا ساغر سے یاد ہے نظام
منہ موڑ کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

بہر حال ہمیں خوشی ہوئی کہ یہ حضرات کچھ تو روبہ کعبہ ہوئے۔

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

آپ ہنوز ترش رو ہیں کہ یہ حضرات مسلمانوں کے مطالبہ کی کامل ہمنوائی کیوں نہیں کرتے جو یکسر مسلمانوں کی آزادی کے مرادف ہے لیکن ہم خوش ہیں کہ یہ حضرات۔ غیروں سے کٹ کر ایک قدم اپنوں کی طرف تو بڑھے۔ بھلا ایک ہی جست میں کس طرح کاشی سے مکہ جا پہنچیں۔ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھکر سوچئے کہ غلطی کے کھلے کھلے اعتراف کے لئے کس قدر ہمت اور حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے جلدی نہ کیجئے کسی کو مطعون کرنے سے پیشتر اس کی مجبوری پر ضرور نگاہ ڈالئے۔

اک عمر کا رشتہ ٹوٹا ہے!	مدت کا سہارا چھوٹا ہے!
دل سنبھلتے سنبھلتے سنبھلے گا!	صبر آتے آتے آئے گا

گھبرائیے نہیں ان حضرات کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔ اب انشاء اللہ آہستہ آہستہ ہ

آئیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

ہم اس لئے پرامید ہیں کہ ان حضرات نے اپنے دعوے کے ثبوت میں جو دلیل پیش کی ہے وہ اس قدر بودی ہے کہ اسے محض منہ رکھنے کی خاطر دلیل کہا جا سکتا ہے۔ جب یہ حضرات ذرا اور ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے تو ان پر اس کی کمزوری خود بخود واضح ہو جائے۔ جھگڑا تو سارا **مرکز کا ہے**۔ اب دیکھئے کہ مرکز کے مفید اور مضر ہونے کے متعلق ان حضرات نے کیا فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

(۱) ایک مستحکم مرکز کے ماتحت نظام حکومت مسلمانوں کے غلامی کے مرادف ہوگا۔

(۲) اس مرکز کو کمزور کر دیا جائے (جیسا کہ جمعیۃ العلماء کا خیال ہے) تو مسلمانوں کے مذہبی حقوق۔ مقدس شعائر۔ خواہ وہ اقلیتوں کے صوبوں میں ہوں یا اکثریت کے سب محفوظ ہو جائیں گے۔ اور

(۳) اگر اس مرکز کو بالکل اڑا دیا جائے (جیسا کہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے) تو اس سے (جمعیۃ العلماء کے خیال میں) مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ ان کے مذہبی حقوق پامال ہو جائیں گے ان کے مقدس شعائر منہدم ہو جائینگے

وغیرہ وغیرہ

آپ نے اس منطق پر غور فرمایا کہ

(۱) مرکز کو مستحکم رکھنے میں مسلمانوں کی غلامی اور بربادی

(۲) اسے کمزور کرنے میں آزادی اور ۔

(۳) اسے بالکل فنا کر دینے میں پھر غلامی اور بربادی یعنی

(۱) سانپ کو کھلا چھوڑنے میں ہلاکت ۔

(۲) اسے زخمی کر کے چھوڑ دینے میں عافیت اور

(۳) اسے مار ڈالنے میں پھر ہلاکت

ہمارا خیال ہے کہ جناب مدنی صاحب نے جان بوجھ کر ایسا کمزور مسلک پیش کیا ہے۔ تاکہ اگلا قدم اٹھانے میں آسانی رہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور ان لوگوں کا خیال غلط ثابت ہو جو ان حضرات کو ختم اللہ علی قلوبھم کی شق میں سمجھے ہوئے ہیں۔

اب ذرا پاکستانی اسکیم کے خلاف اعتراض ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے

"یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ مجوزین تقسیم ہند کے نزدیک بھی اسلامی منطقہ میں قائم ہونے والی حکومت کا دستور اساسی بھی اسلامی اور دینی حکومت کا دستور نہ ہوگا۔ اسکی بنیاد بھی یورپین طرز پر ہوگی"

ہم اس اعتراض کی تردید میں زیادہ کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے۔ اس نظریہ کو حضرت علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں ان الفاظ سے ساتھ پیش فرمایا تھا۔

"ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے"

اور آج اس اسکیم کے علمبردار جناب جناح کا اسلامی حکومت کے متعلق کیا خیال ہے اس کے لئے طلوع اسلام کے اسی اشاعت کے اولین اور اق (بعنوان قائد اعظم) ملاحظہ فرمالیجئے بات خود بخود واضح ہو جائے گی۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ پاکستان سے کیا مفہوم ہے۔ ایک سچے مسلمان کی کیا روش ہونی چاہئے یہ ہم سے نہیں خود مدنی صاحب سے سنئے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

اگر کسی جدوجہد کے نتیجہ میں خدا کی ایک فرمانبردار ملت کو دنیا کے کسی حصہ میں خدائی احکام کے مطابق یا اس سے قریب تر کوئی اجتماعی نظام قائم کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہوں تو اس کو اسلام کی تائید حاصل ہو سکتی ہے اور صرف اسی جدوجہد کو اسلام نے جہاد فی سبیل اللہ اور

قتال فی سبیل اللہ قرار دیا ہے۔
ہم اس جدوجہد کی طرف آپ کو دعوت دیتے ہیں مسلم لیگ اسی جدوجہد کی حامل ہے۔

اس کے بعد جناب مدنی فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات محض انگریز کے پیدا کردہ ہیں (یعنی وہی دلیل جو سائے وار دہا سے نازل ہوا کرتی ہے) ان سے پہلے کہیں اختلافات دکھائی نہیں دیتے تھے اس کے بعد کئی صفحات میں ایسے تاریخی شواہد پیش کئے ہیں جن سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ انگریزوں سے پیشتر مسلمانوں اور ہندوؤں کے دور میں مسلمان اور ہندو سب شیر و شکر ہو کر رہتے تھے۔ کہیں اختلافات و تنازعات نہ تھے۔ وغیرہ وغیرہ

لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے عہد حکومت میں اگر باہمی تنازعات نہ تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں مسلمان حاکم تھے۔ ہندو محکوم کی حیثیت سے رہتے تھے۔ اس لئے محکوم کا حاکم سے جھگڑا کیسا۔ اسی طرح جہاں ہندو حاکم تھے مسلمان ان کی رعایا تھے۔ راجہ اور پرجا میں لڑائی کیسی! جھگڑے اور تنازعے تو اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوت کی تقسیم کا سوال پیدا ہو آپ تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی یاد دلاتے ہیں ذرا پچاس برس ادھر خود انگریز کے عہد حکومت میں دیکھئے۔ کہیں ہندو مسلم سوال نظر آئے گا۔ اس لئے کہ قوت پوری کی پوری انگریز کے ہاتھ میں تھی۔ ہندو مسلمان دونوں رعایا تھے۔ جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب قوت انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آنے لگی۔ اس وقت ہندو نے تہیہ کر لیا کہ مسلمان سے اس کی آٹھ سو سالہ حکومت کا انتقام لیگا۔ جب تک مسلمان سویا رہا اور قومیت پرست حضرات نے اسے تھپکیاں دے دے کر اور بھی گہری نیند میں سلائے رکھا۔ ہندو اپنی من مانی کرتا رہا۔ کہیں لڑائی جھگڑا نہ تھا۔ لیکن جونہی مسلمان بیدار ہوا اور اس نے ہندو ہمسایہ سے کہا کہ مہاراج! خدا کی اس زمین میں دوسروں کو بھی زندہ رہنے کا حق دیجئے تو وہیں جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہ ہے ہندو مسلم تنازعات کا پس منظر۔ چونکہ ہندوؤں نے ایک مدت سے شور مچا رکھا ہے کہ سب جھگڑے انگریز کے پیدا کردہ ہیں۔ اسے یہاں سے نکال دو۔ سب جھگڑے طے ہو جائیں گے اس لئے آپ حضرات بھی ان کے دام فریب میں آ گئے۔ اور یہ نہ سوچا کہ ہندو ایسا کیوں کہہ رہا ہے! —

اختلافات و تنازعات کی داستان دہرانے کے بعد جناب مدنی جس نتیجہ پر پہونچے ہیں - وہ وہی ساز کہن ہے کہ جداگانہ انتخاب بھی انگریز ہی کا کرشمہ ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

> مسلمانوں کے ایک بڑے ذی بصیرت اور ماہر سیاست طبقہ کی رائے میں جداگانہ انتخاب مسلمانوں کیلئے زیادہ مضر ہے اور یہ تو یقینی ہے کہ اس کی موجودگی میں مختلف فرقوں کے درمیان آشتی اور سیاسی اور معاشرتی یگانگت اور اتفاق پیدا ہونا ناممکن ہے جو ہندوستان جیسے ملک کیلئے ناگزیر ہے جمعیت علماء ہند نے اس پر متعدد مجالس میں غور و بحث کرکے یہ سمجھا ہے کہ جمہوری اور نیابتی طرز حکومت کی صورت میں مخلوط انتخاب ہی پبلک کے درمیان رابطہ مودت و اتحاد قائم رکھ سکتا ہے اور جداگانہ انتخاب ہمیشہ باہمی اختلاف اور کشمکش بلکہ فتنہ و فساد پیدا کرنے کے سوا کسی مفید نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا جمعیۃ علماء نے اپنے سہارنپور والے فارمولا میں مسلم حقوق کی حفاظت کے تمام ذرائع اور شرائط محفوظ کرتے ہوئے مخلوط انتخاب قبول کرنے کی تجویز اسی نظریہ کے ماتحت رکھی تھی۔

ذرا اس ٹکڑے پر دوبارہ غور فرمائیے!۔

> "جمعیۃ العلماء ہند نے اس پر متعدد مجالس میں غور و بحث کرکے یہ سمجھا ہے کہ جمہوری اور نیابتی طرز حکومت کی صورت میں مخلوط انتخاب ہی پبلک کے درمیان رابطہ مودت و اتحاد قائم رکھ سکتا ہے"

یعنی (۱) وہی جمہوری حکومت جسے ابتدائی صفحات میں لعنت قرار دیا گیا ہے۔ اس کے استحکام کے لئے مخلوط انتخاب ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔

(۲) مخلوط انتخاب کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں مودت کا رشتہ محکم ہوگا! کیا ہم جناب مدنی سے دریافت کر سکتے ہیں کہ کافر و مومن میں سلسلہ مودت و مواخات قرآن کریم کی کونسی آیت اور اسوۂ نبی اکرمؐ کی کونسی شق کے مطابق جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد نفس مضمون پر آئیے یعنی مخلوط انتخاب میں مسلمانوں کے لئے کیا کیا خطرات ہیں۔ سو اس کی تفصیل ہم سے نہیں، جناب مدنی سے سنئے! آپ نے سنہ ۱۹۲۸ء میں جناب شوکت علی مرحوم کے خط میں لکھا تھا:

> خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے مخلوط انتخاب قبول کرنے سے حالانکہ وہ مشروط تھا فائدہ اٹھایا گیا اور قبل از تحقیق اعلان کر دیا گیا کہ مسلمانوں نے مخلوط انتخاب قبول کر لیا ہے اب نشستوں کے

تعین کو بھی اٹھا دو اور اس حیلہ سے اٹھا دو کہ اکثریت کے لئے کسی جگہ نشستیں متعین نہ رہیں مسلمانوں کے لئے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے مخلوط انتخاب ہی میں خطرہ تھا یعنی ہندو اثرات کی بنا پر ایسے بھیس بھرے مسلمان منتخب ہوں جو بے دین، ایمان فروش اور ہندو پرست ہوں۔ صورت ظاہر میں مسلمان ہوں اور باطن میں ہندو ہوں۔ ان سے جن کی تعلیم یافتہ طبقوں میں کثرت ہے کس اسلامی مفاد کی امید کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اب جبکہ نشستیں بھی اٹھ گئیں تب تو مسلمان کا کسی بھی صوبہ میں اپنی شمار کے موافق ان نشستوں کا حاصل کرنا مستحیل ہوگا۔"

— یہ دلیل کسی اضافے کی محتاج نہیں۔ یہ حقیقت ہے اور واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندو کو اعتماد ہی اس مسلمان پر ہوتا ہے جو بے دین۔ ایمان فروش۔ اور ہندو پرست ہو۔ اور ہمیشہ بھیس بھر کر ان کے ایجنٹ کی حیثیت سے ملت اسلامیہ سے غداری کرتا ہے!

ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں۔ اور ہماری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں اس لئے کہ ایک سچے عالم کی جتنی قدر ہمارے دل میں ہے شاید ہی کسی اور قلب میں ہوگی۔ ہم ایسے عالم کی خاکِ رہگذر کو اپنی چشم بصیرت کا سرمہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا دل خون ہو کر رہ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی غلط روی اور رہبر بانگی میں عالم کے صحیح مرتبہ کو خاک میں ملا دیا اور آج مولوی کا لفظ انتہائی جہالت اور تنگ نظری کا مظہر قرار پا گیا۔ ملت اسلامیہ کی اس سے بڑی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے! آج وقت وہ تھا کہ یہ گروہ علماء کرام۔ ہندوستان کی تحریک آزادی اسلام میں سب سے پیش پیش ہوتا۔ ان کی ہر مجلس اور ہر محفل۔ ہر منبر اور ہر مسند سے یہ صدائے حق بلند ہوتی کہ ہم انسانوں کی حکومتوں کا خاتمہ کر کے ہندوستان کے (کم از کم) ایک گوشہ میں خالص خدائی حکومت کو قائم کریں گے اور یہاں اپنی قوتوں کو مستحکم کر کے پھر سارے ہندوستان اور ساری دنیا میں لوائے محمد الرسول اللہ کو سربلند و سرفراز کریں گے۔ یہ کہتے اور مسلمانوں کو دعوتِ سرفروشی اور جاں سپاری دیتے۔ پھر دیکھتے کہ ان کی عزت اور قوم کی عظمت کا کیا رنگ ہوتا۔

لیکن اللہ کی شان کہ آج یہ سعادت اسے نصیب ہے جس نے عمر بھر کبھی کسی مکتب کی شکل نہیں دیکھی۔ آج

وہ اعلان کر رہا ہے کہ اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اطاعت کا مرجع خدا کی ذات اور اس کی عملی شکل قرآنی احکام کا عملی نفاذ ہے۔ اس کی طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے۔ اور علماء کرام سے اس کی

مخالفت ہو رہی ہے۔ توبہ توبہ۔

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

ہم ان حضرات کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش کریں گے کہ ضد اور حسد کو چھوڑ کر اب حقیقت ثابت ہو گئی ہے کھلے الفاظ میں اقرار کر لیں۔ اس میں کسی قسم کی تحقیر نہیں۔ غلطی کس سے نہیں ہو جاتی۔ آئیں۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت میں بصدق دل شامل ہو جائیں جس کا نصب العین ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام و بقا ہے۔ اس میں شامل ہوں اور پھر اللہ کی حکومت کے قیام کے لئے مسلمانوں کی قیادت کریں۔ دنیا میں بھی سرفرازی ہو اور عاقبت میں بھی سرخروئی۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ حضرات جب مسلمانوں کے مطالبے کے اس قدر قریب ہو چکے ہیں تو اس کے بعد ایک کر بچھڑے ہوئے بھائیوں کے گلے مل جانے میں کچھ حجاب ہو گا؟ خدا آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

جمعیۃ العلماء نے اپنے اجلاس لاہور میں چند تجاویز ایسی بھی پاس کی ہیں جنھیں دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ اب ان حضرات کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھتا دکھائی دے رہا ہے۔

تجویز (۱) جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی کہ فقہ اسلامی عبادات و معاملات تمدن اور معاشرت سیاست اور اقتصادیات کے تمام اصول پر حاوی ہے۔ دیکھ رہا ہے کہ عصری ایجادات اور غیر اسلامی اصول اقتصادیات کے رواج سے ایسی صورتیں پیش آرہی ہیں کہ ان کے جواز و عدم جواز کے بارے میں علماء مختلف الرائے ہو جاتے ہیں اور ان کا باہمی اختلاف مسلمانوں کے لئے موجب تشویش و پریشانی ہوتا ہے۔

اس لئے یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ جمعیت علماء ایسے جدید پیش آنے والے مسائل میں علماء متبحرین کی معتمد جماعت سے تبادلۂ خیالات اور بحث و مباحثہ غور و فکر کے بعد ایسے فیصلے مرتب کرائے جن پر علماء متبحرین کی زیادہ سے زیادہ جماعت متفق ہو پھر ان فیصلوں پر عمل کرنے کے لئے مسلمانوں میں شائع کر دیا جائے۔" ؎

یہ وہ مسلک ہے جس کی طرف ہم چار برس سے مسلسل دعوت دے رہے ہیں اور جس کی بنا پر ہمیں ہدف طعن و ملامت بنایا جا رہا ہے۔ الحمد للہ کہ ان حضرات کو اس ضرورت کا احساس ہو گیا۔ لیکن ہم ان کی خدمت میں ایک اہم گذارش ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ آپ لاکھ جتن کر لیجئے، کوئی متفق علیہ مسلک اختیار نہ کر سکیں گے تاوقتیکہ آپ اپنے اختلافی معاملات کا حل قرآن کریم سے طلب نہیں فرمائیں گے۔ اختلافات صرف قرآن کریم سے مٹ سکیں گے

کہ قرآن کریم کا مقصد ہی اختلافات کا مٹانا ہے۔

ایک دوسری تجویز میں کہا گیا

(۲) جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ وقت کی نزاکت اور باہمی افتراق و انشقاق کی ہلاکت خیزی اور اس کے عواقب و نتائج مشئومہ کا پورا پورا احساس کریں اور ان مختلف فیہ مسائل میں جو دور اول یعنی حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اور تابعین و ائمہ مجتہدین کے زمانہ سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں، باہم دست و گریباں نہ ہوں۔ اپنی اپنی جگہ اپنے عقیدہ کے موافق مذہب راجح پر عمل کرتے ہوئے دوسرے خیال کے مسلمانوں پر زبان طعن دراز نہ کریں اور سب و شتم سے محترز رہیں۔ انما المومنون اخوۃ کے ماتحت بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کریں اور باہمی تعاون و تعاضد کر کے کالبنیان یشد بعضہ بعضاً ایک مستحکم اور مضبوط دیوار بن جائیں جس کو کسی مخالف کی دشمنی کسی قسم کا گزند نہ پہونچا سکے۔

اسی طرح یہ جلسہ موت و حیات کی کشمکش کے اس دور میں تمام مسلم جماعتوں سے دردمندانہ اپیل کرتا ہے کہ اسلام اور قوم کی فلاح و نجات کی خاطر آپس کے اختلاف کو دلائل و براہین کی روشنی میں تحقیق حق کے اصول پر وضع کرنے کی سعی کریں۔ اور اختلاف رائے کے باوجود باہمی منافرت اور توہین و تذلیل کا مذموم طریقہ اختیار نہ کریں کہ یہ اسلامی وقار اور قومی زندگی کے لئے تباکن اور اسلامی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔

یہ تجویز بھی موجب اطمینان ہے۔ اور مقام مسرت ہے کہ وہ حضرات جو اپنی ہستی کا راز فرقوں کے قیام میں دیکھتے تھے۔ آج زمانہ کے ہاتھوں اتنے مجبور ہو چکے ہیں کہ فرقہ بندی کی لعنت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ضرورت محسوس فرما رہے ہیں خدا کا احسان ہے کہ اس نے ان حضرات کے دل میں یہ نیک خیال پیدا کر دیا۔ اس تجویز کے بارے میں ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بحالات موجودہ اس مسلک پر کاربند ہو جائے کہ اصول دین میں اتفاق کر کے فروعات کے اختلافات کو اہمیت نہ دی جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دین کے حقیقی نظام کے قیام کی فکر کیجئے۔ اور وہ نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت ہو جس میں قرآن کریم کا قانون عملاً نافذ ہو اور اختلافات کی صورت میں مرکز ملت کی طرف رجوع کیا جائے۔ جب تک یہ نظام

قائم نہ ہوگا۔ دین اپنے صحیح اور حقیقی خطوط پر متشکل نہ ہوگا۔ حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ مقدسہ نے دین کے تمکن کی یہی شکل بتائی ہے

ایک اور تجویز میں کہا گیا ہے۔

تجویز بابت مدارس عربیہ کا نصاب | جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس مدارس عربیہ دینیہ کے مروجہ نصاب میں دورِ حاضرہ کی ضرورتوں کے موافق اصلاح و تبدیلی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے اور مدارس عربیہ کے ذمہ دار حضرات اور تعلیمی جماعتوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لئے باہمی شورے اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب مرتب کرائیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضروریات عصریہ میں بھی مہارت پیدا کرنے کا کفیل ہو۔

اللہ کا شکر ہے کہ ان حضرات نے اس ضرورت کو بھی محسوس کر لیا۔ ورنہ ہم نے جب کبھی ان کے نصاب پر تنقید کی۔ ہمیشہ پیشانی کے تیوروں سے اس کا جواب ملا۔

ایک اور تجویز میں کہا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ ایک شہر میں بلا ضرورت دس دس بیس بیس مساجد میں نماز جمعہ قائم کرنے سے احتراز کریں۔ کیونکہ اس تعداد و انتشار سے نماز جمعہ قائم کرنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور شوکت اسلامیہ کے اظہار میں خلل پڑتا ہے حتی الامکان ایک مسجد میں تمام مسلمان نماز جمعہ ادا کریں۔ صرف وسیع شہروں میں نہایت شدید ضرورت کی بنا پر دو یا تین مساجد میں جمعہ پڑھا جائے تو مضائقہ نہ ہوگا۔ غیر ضروری تعدد کو جس نے جمعہ کی نماز کو بھی پنجگانہ نمازوں کی حیثیت دیدی ہے، جہاں تک جلد ممکن ہو موقوف کر دیا جائے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا ہوتا کہ جمعہ کا خطبہ اس زبان میں دیا جائے جسے سامعین سمجھتے ہوں۔ ورنہ اس کے بغیر خطبہ اور اس طرح جمعہ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ مساجد اس صورت میں آباد ہوں گی کہ ان میں صحیح دینی کشش پیدا کی جائے اور مسلمانوں میں وحدت اس شکل میں پیدا ہوگی کہ اختلافی مسائل کو چھوڑ کر جمعہ میں دین کے اصول کے متعلق خطبات دیئے جائیں۔

ہم ان تجاویز کو دیکھ رہے ہیں اور ہماری جبینِ نیاز اس درگاہِ صمدیت کے عتبۂ عالیہ پر بہ ہزار خشوع وخضوع جھک رہی ہے کہ اس نے ان ناتواں وضعیف بندوں کی آواز میں یہ اثر پیدا کردیا کہ چار سال کے قلیل ترین عرصہ میں مولوی صاحبان کے گروہ میں یہ انقلاب نظر آرہا ہے۔ حالانکہ ان حضرات کے سبّ وشتم سے بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ یہ کبھی اس راہ کی طرف نہیں آئیں گے لیکن صداقت کی آواز ضرور اثر کرتی ہے۔ یہ اللہ کا احسان ہے جس کے لئے ہم اس کے حضور ہمہ تن سجود ہیں۔

ایک اور تجویز میں کہا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اسلامی ممالک خصوصاً عراق، ایران شام وفلسطین وغیرہ کے موجودہ نازک ترین حالات کو نہایت خطرہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کہ ان اسلامی ممالک کو استعمار پسند طاقتیں کس طرح اپنے اغراض فاسدہ میں استعمال کرنے کے لئے مقہور ومجبور کررہی ہیں۔ ان کی تسلیم شدہ آزادی کو پامال کیا جارہا ہے یا ان کے فطری حقِ آزادی سے انھیں محروم کرنے یا رکھنے کے لئے کیسے کیسے حیلے تراشے جارہے ہیں جمعیۃ علماء بار بار اس امر کا اعلان کرچکی ہے اور آج بھی اس اعلان کا اعادہ کرتی ہے کہ اسلامی ممالک پر کسی اجنبی طاقت کا تسلّط اور قہر وغلبہ مسلمانانِ عالم کسی طرح برداشت نہیں کرینگے اور جب تک اسلامی ممالک پر سے استعمار پسند طاقتیں اپنا تسلّط بالکلیہ نہ اٹھالیں گی اور ان کو آزادیٔ کامل کی فضا میں سانس لینے کا موقعہ نہ دینگی اس وقت تک مسلمان چین سے نہیں بیٹھیں گے اور مطمئن نہ ہوں گے۔

اس تجویز کی تائید میں جناب احمد سعید صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم سے اگر کہا جائے کہ تمہیں دوسری سلطنتوں کے رہنے یا جانے کا کیا فائدہ یا غم۔ تو ہم کہیں گے کہ تمام دنیا کے مسلمان اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ وہ غیر نہیں ہیں۔ اور جس طرح اگر کسی غریب آدمی کا کوئی رشتہ دار امیر ہو تو گو وہ اس کی دولت میں حصّہ دار نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اسے ہمیشہ یہ خوشی اور حوصلہ ہوتا ہے کہ میرا ایک رشتہ دار امیر ہے اور یہی اس کی عزّت کا باعث ہے۔ دوسرے لوگ بھی اس کو کچھ کہنے یا نقصان پہنچانے سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ امیر رشتہ دار اس کی مدد کو آجائے۔ اسی طرح غلام مسلمان بھی ہمیشہ اس احساس سے سرشار رہتا ہے کہ میرے دوسرے بھائی برسرِ حکومت ہیں اور مجھے کسی دشمن سے گزند پہونچنے کا احتمال نہیں۔ اگر کوئی اس قسم کا ارادہ بھی کرے گا تو میرا آزاد مسلم

بھائی میری مدد کو آئے گا۔

اس تقریر کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد جناب حسین احمد صاحب مدنی کے خطبۂ صدارت کے اس حصہ پر غور کیجئے جو پچھلے صفحات میں نقل کیا جا چکا ہے اور جس میں انھوں نے پاکستان کی اسکیم کے خلاف یہ اعتراض عائد فرمایا ہے کہ اس سے "ہندو منطقوں میں مسلمان جن کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ ۱۴ فیصدی اور اکثری طور پر سات یا پانچ فیصدی ہوگی۔ بالکل بے دست و پا اور زندہ در گور ہو جائیں گے"۔

ہم جناب مدنی سے دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ جب جناب احمد سعید صاحب کے خیال کے مطابق۔ پنجاب کے غلام مسلمان کے لئے یہ امر باعث ہزار اطمینان ہے کہ افغانستان میں اس کا بھائی خوش حال آزاد اور طاقتور ہے اور اس کی وجہ سے یہاں کا کوئی دشمن اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ تو کیا پنجاب کے آزاد اور طاقتور ہونے کی صورت میں۔ یو۔ پی کے مسلمان کو یہی اطمینان نصیب نہ ہو جائیگا کہ اس کا بھائی پنجاب میں طاقت اور حکومت کا مالک ہے۔ اس لئے اس کی طرف کوئی دشمن آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا! مسلم اکثریت کے صوبوں کی کامل آزادی اور اپنی جداگانہ حکومت جس میں دفاع۔ امور خارجہ۔ مالیات وغیرہ کا نظم و نسق سب اپنے ہاتھ میں ہوگا۔ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے ہزار تقویت کا باعث ہوگا۔ اگر مدراس کے مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھیگا تو پنجاب کے مسلمان کی آنکھ میں نیند حرام ہو جائے گی۔ اور جب کسی دست دراز کو یہ معلوم ہو کہ مظلوم بے کس و بے یار نہیں بلکہ اس کی تکلیف اس کے کروڑوں طاقتور اور آزاد بھائیوں کے لئے وجہ اضطراب ہوگی۔ تو وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے سے پیشتر سو مرتبہ سوچے گا۔

بہر حال جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے یہ امر موجب اطمینان ہے کہ ہمارے ان غلطی خوردہ بھائیوں کا قدم اب صحیح راستہ کی طرف اٹھ رہا ہے۔ خدا کرے کہ اب ان میں یہ توفیق پیدا ہو جائے کہ کشادہ ظرفی سے اپنی غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کر کے بچھڑی ہوئی ملت سے پھر آملیں اس میں یقیناً ملت اسلامیہ کی بھی بہبود ہے۔ لیکن ملت سے زیادہ خود ان حضرات کے وقار کا راز بھی اس میں مضمر ہے۔ اب وہ زمانہ گذر گیا کہ غیروں کو ان حضرات کی ضرورت تھی اب ہندو اور انگریز دونوں جانتے ہیں کہ ملت کا ساتھ چھوڑنے والوں کی مسلمانوں کی نگاہ میں کیا وقعت ہوتی ہے۔ اس لئے نہ تو اس اعتبار سے ہی انھیں ان کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان کی سیاسی بصیرت کی بنا پر جس کے افلاس کی مثال خود جناب مدنی کا خطبۂ صدارت ہے۔ خدا کرے کہ ان حضرات کی سمجھ میں یہ بات

حقائق و عبر

۱۔ جمہوریت مغرب کے جمہوری نظام کے متعلق۔ مشرق کے دیدہ ور نے کہا تھا

گریز از طرزِ جمہوری۔ غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

تو اس پر مغرب بھی ہنسا اور مغرب کی نقالی کرنے والے بھی۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک یہ نظامِ حکومت انسانی فکر کے ارتقاء کا نقطۂ آخر بن تھا اور اس سے بہتر نظام حیطۂ تصور میں بھی نہ آسکتا تھا۔ لیکن ابھی اس دعوے کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ خود اہلِ مغرب نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ مشرق کے دیدہ ور نے سچ کہا تھا۔ چنانچہ دارالعوام میں ایک بحث کے دوران میں "سر الفریڈ ناکس" نے کہا کہ

"جمہوریت اس کے سوا اور کیا ہے کہ سروں کو گن لیا جائے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ اُن سروں کے اندر کیا ہے!" (ہندوستان ٹائمز 26/2/42)

دیکھئے۔ لفظ بلفظ ترجمہ ہے اس مصرعہ کا۔ "کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید"۔ ابھی آگے آگے دیکھئے کہ مغرب کو اپنے غیر فطری نظامِ زندگی کی کون کون سی کڑیوں کو لعنتی قرار دینا پڑتا ہے۔ ابھی تو اس نظام کے عواقب کی ابتدا ہے۔ لیکن مغرب سے کہیں بدتر حالت اس کے مشرقی نقالوں کی ہے۔ وہاں اس نظام کے متعلق یہ آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور یہاں اسے ابھی تک نوعِ انسانی کی تمام مصائب و مشکلات کا مداوا قرار دیا جا رہا ہے۔ ہندو تو ایک خاص مقصد کے ماتحت اسے اُبھارتا ہے۔ وہ اس جمہوری قبا کے پردہ میں اپنی اکثریت کی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن ذرا ان نیشنلسٹ مسلمانوں سے پوچھئے کہ یہ کس مقصد کے ماتحت اس کی حمایت کئے جا رہے ہیں؟ کیا محض اس لئے نہیں کہ ہندو ایسا کہلوانا چاہتے ہیں؟

۲۔ بڑے بوڑھوں کی غلطی

یوں تو بیکاری ہر جگہ لعنت ہوتی ہے لیکن جب کوئی عورت بیکار ہو جائے تو وہ ایک عجیب قسم کی مصیبت بن جاتی ہے اور ایسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتی ہے جس سے ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ اس مرض کا شکار محترمہ بیگم شاہنواز صاحبہ ہیں، جنھیں بیکاری اور فارغ البالی کے ہاتھوں مجبوراً لیڈر بننا پڑا ہے۔ اور اب آئے دن ان کی طرف سے کوئی نہ کوئی ایسی بات کان میں پڑتی رہتی ہے جسے سُن کر افسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں گورنمنٹ کالج کے جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت کے موقع پر آپ نے فرمایا :۔

"جتنا کوئی شخص فرقہ داری کے اس خار دار مسئلہ کا مطالعہ کرے گا اتنا ہی وہ اس امر کا احساس کرے گا کہ مُلک کی موجودہ صورتِ حالات کے ذمہ دار ہمارے بڑے بوڑھے تھے، انھوں نے ہر ایک جماعت کے کلچر (ثقافت) کو اس طرح دوسروں سے الگ تھلگ رکھا کہ ہر جماعت کا تشخص جداگانہ رہا اور اس طرح نہ تو ہندوستان میں ایک مشترکہ کلچر ہی تیار ہو سکا اور نہ ہی ہندوستان کی متحدہ قومیت ہی بن سکی" (ہندوستان ٹائمز ۲۵ ۳/۴۴)

اپنے بڑے بوڑھوں کی جس غلط روش کا رونا جنابہ بیگم صاحبہ نے رویا ہے اس کا تو کچھ کچھ مطلب سمجھ میں آگیا لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اگر بزرگوں نے اس باب میں کوتاہی کی تھی تو انھوں نے اس کی تلافی کس طرح سے کی اور وہ کون سا ایسا قدم اُٹھایا جس سے ہندوستان میں ایک مشترکہ اور متحدہ قومیت کی بنیاد پڑ جائے؟

کس قدر رنجدہ ہے اس حقیقت کا احساس کہ یہ خیالات سر شفیع مرحوم کی نورچشم کی طرف سے باہر آرہے ہیں اور وہ بھی اُس وقت جب ہندوستان کی "متحدہ قومیت" کا تصور اپنوں بیگانوں سب کی نگاہ میں زعمِ باطل بن چکا ہے۔ اگر مقصود فقط شہرت اور ہر دلعزیزی ہی ہے تو اس کے لئے بھی اب کسی جدت کی ضرورت ہے۔ یہ پامال، فرسودہ اور پیش پا افتادہ مضمون تو اب کسی کے لئے بھی جاذبِ توجہ نہیں رہا۔

ہم حیران ہیں کہ جن بچوں کی تربیت ایسی ماں کی گود میں ہوئی ہو قوم ان سے کیا توقع رکھ سکتی ہے؟ مسلمان خاتون کے لئے تو ایک ہی طرزِ زندگی وجہ افتخار و سعادت تھا۔ یعنی

اتباعِ اُسوۂ حضرت سیدۃ النساء میں۔

آسیا گرداں و لب قرآں سرا

لیکن لیڈری میں یہ چیزیں کہاں!

۳۔ جشنِ میلاد | گزشتہ اشاعت میں ہم نے محکمۂ ریڈیو کے اربابِ بست و کشاد کی توجہ اس طرف منعطف کرائی تھی کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے حضور تاجدارِ مدینہ۔ سرورِ کائنات (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی تعریف و توصیف میں اس قسم کی نعتیں نشر کیا کریں جو اس ذاتِ عالی مرتبت (فداہ ابی و اُمی) کی شانِ گرامی کے منافی ہوں۔ اس اشاعت کے بعد یہ مہینہ ربیع الاوّل کا آیا جس کی بارھویں تاریخ وہ مقدس دن ہے جس کے احترام میں آسمان جھک کر زمین کو سلام کرتا ہے اور ہر اس مسلمان کے نزدیک جس کے دل میں ایمان کی کوئی رمق بھی موجود ہے دُنیا کی ہر عزیز سے عزیز تر متاعِ گراں قدر ہے۔ اس تقریبِ سعید پر محکمۂ ریڈیو کی طرف سے خاص پروگرام نشر کیا گیا۔ لیکن وہ پروگرام کیا تھا! ملاحظہ فرمایئے۔

جشنِ میلاد۔ (لاہور)

شمشاد بیگم اور امراء ضیاء بیگم ۔ سلام حفیظ جالندھری

فضل محمد اور سرفراز خاں ۔ نعت خوانی

طمنچہ جان ۔ نعتِ محسن

نسیم اختر ۔ نعتِ نصیر

لکھنؤ کے پروگرام میں "ہندوستانی میں بات چیت" اور درود و سلام کے بعد عرش منیر گوہر سلطان اور بے نظیر بائی کے نام نعت خوانی میں پیش کئے گئے۔

غور فرمایا آپ نے کہ اس جشنِ مقدس کو کس انداز سے منایا جا رہا ہے جس کی ایک ایک ساعت دنیا کے چالیس کروڑ فرزندانِ توحید کے لئے وجہِ صد ہزار سعادت ہے اور جس کی یاد میں اللہ اور اس کے

فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں۔ ہم محکمہ ریڈیو سے کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ انھیں کچھ کہنا بے سود ہے لیکن ہزار تاسف ہے خود مسلمانوں کی بے حسی اور (معاف فرمایئے) بے حمیتی پر کہ وہ ان تمام چیزوں کو دیکھتے اور سنتے ہیں اور نہایت خاموشی سے آگے گذر جاتے ہیں۔ گویا ان سے ان باتوں کا کچھ واسطہ ہی نہیں۔ غیرت: ایمان کی سب سے بڑی نشانی ہے بلکہ یوں کہئے کہ ایمان ماپا ہی اسی مقیاس سے جاتا ہے۔ سو جس قوم پر اس درجہ افسردگی اور بے حمیتی چھا جائے کہ وہ زندگی کے ایسے اہم معاملات سے یوں بے تعلق ہو جائے اس کی موت پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے۔ کم ہے۔ اور پھر طرفہ تماشا یہ کہ ان چیزوں کی اصلاح میں کسی ایثار اور قربانی کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے نہ کسی ہنگامہ آرائی کی ضرورت ہے نہ غوغا آرائی کی۔ کرنا صرف اتنا ہوتا ہے کہ محکمہ ریڈیو کو اطلاع دیدی جائے کہ پروگرام میں فلاں فلاں شق ہمارے ذوق۔ عقیدہ اور احترام کے خلاف ہے۔ آئندہ اسے بدل کر یوں کر دیا جائے۔ جب عوام کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ ہو تو وہ ایسے مطالبہ کو کبھی رد کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن ہمیں مسلمانوں سے امید نہیں کہ وہ اتنا بھی کر سکینگے۔ تو پھر گلہ کس پر !

۴۔ الٹا اثر

ناخدائے کشتی ملت۔ قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کی چندے کی اپیل ملک کے چاروں گوشوں میں پھیل چکی ہے اور اس وقت تک کی اطلاعات سے مترشح ہے کہ ملک کے اطراف و اکناف سے اس کا استقبال انتہائی جوش و عقیدت سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب جناح اپنی بے لوث خدمات کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے قلوب کے نازک ترین گوشوں میں گھر کر چکے ہیں۔ اور ہر مسلمان بلا جبر و اکراہ انتہائی مسرت و محبت سے اپنی عزیز ترین متاع۔ اپنے محبوب و محترم قائد کے قدموں میں نچھاور کرنے کے لئے تیار ہے۔ اور کیوں نہ ہو! جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے چند پیسوں سے یہ رہبر فرزانہ ملک و سلطنت مزید کر دے رہا ہے۔

چنانچہ ایک غریب آدمی نے (جس کا بیان اخبارات میں شائع ہوا ہے) کہا کہ مجھ پر اس اپیل کا ایسا اثر ہوا کہ میرے پاس جو کچھ موجود تھا۔ سب جناب جناح کی خدمت میں بھیجدیا۔ فی الواقع یہ موقع اسی قسم کی درخشندہ مثالیں قائم کرنے کا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ مثال بھی ہمارے سامنے آئی کہ لاہور کے میاں امیرالدین صاحب ایم۔ ایل۔ اے۔ فنانشل سکرٹری صوبہ مسلم لیگ نے قائداعظم کی اپیل شائع کرتے وقت اخبار میں اپنے

علیہ کا بھی اعلان فرمایا ہے۔ میاں امیر الدّین صاحب کی پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے یقیناً آپ متوقع ہونگے کہ اُن کا علیہ (جس کا اعلان بھی ضروری سمجھا گیا) یقیناً ایک گراں قدر رقم ہوگی۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ رقم کتنی تھی! ایک سو روپیہ! اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں کسی پر کچھ جبر نہیں کیا جاسکتا۔ جو کچھ کسی کی طرف سے ملے بہر حال قوم کے لئے باعثِ شکریہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی رقم کے اعلان سے فائدہ کیا تھا؟ خیرات علانیہ بھی ہوتی ہے اور پوشیدہ بھی۔ علانیہ سے مقصد دوسروں کی ترغیب وتشویق ہوتی ہے۔ لیکن جب اعلان سے دوسروں پر اُلٹا اثر پڑے اُسے پوشیدہ ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ اب ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ جب اتنی بڑی پوزیشن کے آدمی نے سو روپیہ دیا ہے تو ہمارے دو روپے ہی کافی ہیں۔ اس کا مجموعی اثر جو کچھ ہوگا ظاہر ہے۔ لہٰذا دیگر حضرات اس امر کا خیال رکھیں کہ اعلان صرف اُن رقوم کا کیا جائے جو دوسروں کے لئے زیادہ سے زیادہ علیہ کی ترغیب دلائیں۔ نہ اُن رقوم کا جو اُبھرے ہوئے دلوں کو بھی بٹھا دیں۔

۵۔ نیک مشورے | کانگریس کے تشدد لیڈر سردار پٹیل نے پچھلے دنوں احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران میں فرقہ وارانہ فساد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ

"جو لوگ ایک جُداگانہ قومیت کے متمنی ہیں اُن میں سے نوّے فی صدی وہ ہیں جو اِس مُلک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنی اصل میں جذب نہیں کئے جاسکتے تو یہ ان لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہو گئے تھے۔" (ہندوستان ٹائمز ۱۴/۳/۴۸)

آپ نے غور فرمایا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا یہ کیا حل تجویز کیا جا رہا ہے اور یہ حل کسی مہاسبھائی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک کانگریسی کی طرف سے ہے اور کانگریسی بھی کوئی غیر ذمہ دار نہیں بلکہ سردار پٹیل کی پوزیشن کا کانگریسی

آگے چل کر تشدد اور عدمِ تشدد کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے سردار صاحب فرماتے ہیں۔

"لوگوں کو فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر بھاگ نہیں اُٹھنا چاہئے بلکہ ایسے فساد کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ اوّل تو عدمِ تشدد سے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو حفاظتِ خود اختیاری کے

قانونی اختیار کو استعمال میں لاکر ۔ عدم تشدد کو کسی صورت میں بھی بزدلی کی نقاب نہیں بنانا چاہیے۔"

یہ وہ حضرات ہیں جو "عدم تشدد" کو دھرم اور عقیدہ کی حیثیت سے پیش کیا کرتے ہیں !

الٰہ آباد

سنہ ۱۹۳۰ء ——— سنہ ۱۹۴۲ء

دنیا میں کوئی حرکت تعجب خیز نہیں ہو سکتی جب تک سامنے کوئی واضح اور غیر مبہم نصب العین نہ ہو۔ جو شخص منزلِ مقصود کو متعین کئے بغیر گھر سے چل نکلتا ہے۔ ہر چند اس کے قدم اٹھتے ہیں۔ لیکن وہ صبح سے شام تک چلتا رہے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ بلکہ عرفِ عام میں اس کی اس حرکت کو "آوارگی" سے تعبیر کیا جائے گا۔ برعکس اس کے اگر وہی قدم تعینِ مقصد کے بعد اٹھیں تو ہر قدم کامیابی و کامرانی کو اپنی طرف کھینچ لائے گا اور یہ راہی زود یا بدیر منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہے گا۔

ہندوستان میں موجودہ سیاسی تحریک کی ابتدا کچھ ایسی آندھی کی طرح ہوئی کہ اس میں ہندوؤں کے سامنے تو ایک متعین مقصد تھا لیکن مسلمان محض اپنے جوش و رقص میں بگولے کی طرح ساتھ ہو لیا۔ اور اس بات کے متعلق پوچھا تک بھی نہیں کہ بالآخر اس باد پیمائی اور دشت نوردی سے مقصد کیا ہے! جب کسی قوم کی رگوں میں خون اور خون میں حرارت ہو تو بہت سے خود غرض انسان قوم کے اس جوش اور ولولہ کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ ان کا فائدہ اسی میں ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا رہے۔ طوفان اٹھتا رہے کہ ان کے نزدیک

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ہندوستان کی سیاسی فضا میں اس قسم کی ہنگامہ خیزی ہو رہی تھی۔ شور و شغب سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ "انقلاب زندہ باد" کے فلک بوس نعرے ایشیا کی موجوں میں طغیانی پیدا کر رہے تھے لیکن دیکھنے والی آنکھ دیکھتی تھی کہ ایک خاموش انسان۔ لاہور کے ایک خستہ اور بوسیدہ مکان کے ایک گوشہ میں

کمبل اوڑھے۔ چارپائی پر لیٹے حُقّے کے کش لگاتا رہتا۔ باہر کی دُنیا کے طوفان سے بظاہر ایسا غیر متأثر گویا اُن سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔ لیکن درحقیقت قوم کی "آوارگی" سے اس قدر دل گرفتہ کہ کوئی وقت ایسا نہیں کہ اس کی بصیرت نواز آنکھوں میں آنسو نہ ڈبڈبا رہے ہوں۔ وہ لوگ جن کے حصولِ مقاصد کا راز ہی جھکڑ اور آندھی" میں تھا۔ اس مردِ خاموش کو "بے عمل" کہتے۔ وہ سُنتا اور مسکرا دیتا۔ کہ اُس کی نگہِ دور رس "عمل" کے ان دعوے داروں کے بے نتیجہ اعمال کا انجام دیکھ رہی تھی۔ ذہنی نقش کے دلدادہ اسے شاعر کہتے تو وہ ہنس دیتا کہ شاعروں کی بے مقصد صحرانوردیاں اس سے پوشیدہ نہ تھیں۔ لفظی گورکھ دھندوں کے شیدائی اسے فلاسفر کہتے تو اس کی آنکھوں کا ہلکا سا تبسم کہہ دیتا کہ یہ دل کی دنیا کو کیا جانیں!

یہ مردِ حق آگاہ اسی طرح خاموش رہا — خاموش۔ اور ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا خاموش۔ وہ خاموش تھا اور باہر کی دنیا سے بظاہر غیر متعلق لیکن بڑے سے بڑے اربابِ حکمت و تدبر کی یہ حالت تھی کہ وہ چپکے چپکے اس کے پاس جاتے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ کچھ لے آتے کہ قوم پھر ان کو سر آنکھوں پر بٹھا لیتی۔ لیکن وہ خود خاموش تھا۔ بالکل خاموش۔ کبھی کبھی اس کی آہِ سحرگاہ ایک مُغنی آتش نفس کے نغمۂ لاہوتی کی طرح خاموش فضا میں تحرک پیدا کرتی اور سمجھنے والوں کے رگ و پے میں دیپک کے سروں کی طرح شعلہ بار ہو جاتی۔ لیکن اس کے بعد وہ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا اور فضا پر پھر وہی خاموشی چھا جاتی۔

افکار و اعمال کی پریشانی سے قوم کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی تو بالآخر یہ مردِ خاموش اللہ کا نام لے کر اٹھا اور ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو بتا دیا کہ ہندوستان میں اُن کی سیاسی جدوجہد کا نصب العین کیا ہے؟ اس مردِ خودشناس نے سب سے پہلے تعارف کے طور پر کہا،

"آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو نگہِ انسانی کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذنِ بال کشائی دیگا۔ جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے

اور جس کا حکم یقین ہے کہ اسلام خود لقدیرِ الٰہی ہے، زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز خیال نہ فرمایئے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ خالص نظری مسئلہ ہے۔ نہیں، یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے۔ جو خود نفسِ اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبردار ہوں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں"۔

اس کے بعد ہندوستان کی مختلف قوموں (ہندو اور مسلمانوں) میں باہمی اتحاد و اتفاق کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"لیکن اس تلخ حقیقت کے بیان کرنے سے صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی اندرونی یکجہتی کے لئے اس قسم کے اصول دریافت کرنے میں جتنی کوششیں کیں وہ ابتک بالکل ناکام رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرے کی نیتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دل میں یہ آرزو میں چھپی ہوئی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فریقِ مقابل پر تغلب و تسلط حاصل کر لیا جائے یا اس کی یہ وجہ ہے کہ باہمی اشتراکِ عمل کے بلند مقاصد تباہ ہوتے ہوں تو ہوں لیکن وہ استمراری اجارہ داری ہاتھ سے نہ جانے پائے جو اتفاقاتِ زمانہ سے ایک فریق کے قبضہ میں آچکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ دماغ میں اَنَا الْمَوْجُوْدُ لَا غَیْرِیْ کا سودا سما رہا ہے۔ لیکن ان جذبات کو قومیت پرستی کے مقدس چولے میں چھپایا جاتا ہے۔ بلند آہنگ دعاوی کو دیکھو تو حبّ الوطنی کی وسعتِ قلبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لو تو وہاں ذات اور قبیلہ" کی وہی پرانی تنگ نظری جلوہ فرما ہے۔ ہاں! اور اس کا یہ بھی باعث ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ہر ایک جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ

اپنی تمدنی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی اجتماعی نشو ونما کر سکے۔"

اس کے بعد فرمایا:-

"جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے وہ نہایت پست فطرت اور ذلیل قوم ہے۔ میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم وشعائر، قوانین وضوابط مذہبی ومعاشرتی ادارات کا بے حد احترام ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کے معابد کی حفاظت بھی کروں۔ بایں ہمہ مجھ اس ملّت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی انتقاد کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے مذہب، اپنے لٹریچر، اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبال کو اقبال بنا دیا ہے اور یوں اپنے درخشندہ ماضی کو ایک جیتے جاگتے زندگی بخش عنصر کی صورت میں میرے حال میں سمو دیا ہے۔"

پھر اپنے اصل موضوع کی طرف آکر بتایا کہ ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ کا سب سے پہلا نصب العین عیاں کیا ہونا چاہیے۔ فرمایا:-

"میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ (ہندوستان کو) حکومتِ خود اختیاری زیر سایۂ برطانیہ ملے، یا اس سے باہر۔ کچھ بھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔"

اس مقصد کی صداقت اور اس نصب العین کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:-

"ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار

طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے۔ لہٰذا باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الذکر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔"

آگے چل کر فرمایا:-

"یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انھیں بھی کہیں اپنی نشو و ارتقا کا موقع ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصدِ وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انھیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔"

اس کے بعد اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ یہ مطالبہ کسی جذبۂ تغلب و استبداد پر مبنی نہیں بلکہ دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی آرزو پر مبنی ہے جو مسلمان کیلئے ایمان کی حیثیت لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ

"حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ" کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جبکہ دنیا میں کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہ آیا تھا اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح بالکل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ پر فٹ ہو۔ وہ اس مشینری کا ایک فعال پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کیلئے اس پر حقوق و فرائض کی

ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔"

اِس نصب العین کو ایسے واضح اور درخشندہ الفاظ میں سامنے لانے کے بعد راستہ کے خطرناک مراحل کی طرف بھی اشارہ کر دیا تاکہ یہ کاروانِ شوق رو بہ منزل ہو تو زادِ سفر اور سامانِ حفاظت کو بھی ساتھ رکھے۔ فرمایا:-

"ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں پر جو نازک وقت آج آچکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدتِ افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ اُن کی یہ تنظیم ملّتِ اسلامیہ اور ہندوستان دونوں کے حق میں مفید ہوگی۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی ایشیا بھر کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ بنی رہی ہے اور اس وقت بھی وہی کیفیت ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اس سرزمین کو اظہارِ خودی کی اس مسرّت سے یکسر محروم کر دیا ہے جس کی برکت سے یہ کبھی ایک عظیم الشّان اور درخشندہ کلچر کی تخلیق کا موجب بنی تھی۔ جس سرزمین (یعنی ہندوستان) کے ساتھ ہمارا جینا اور مرنا وابستہ ہو چکا ہے۔ اس کی طرف سے ہم پر ایک اہم فریضہ عائد ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہم پر ایشیا کی طرف سے اور علی الخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت و حیات کا عالمِ اسلامی پر کیا اثر ہوگا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں اُن سے ہم کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لئے ہم سب منظم طور پر عزم نہ کر لیں۔ ہندوستان کے دیگر

سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم ہوں۔ متحد ہوں۔ ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا کھرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن کے ساتھ ہماری ملت کی موت اور زندگی وابستہ ہے بہت بُری طرح اثر انداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وارانہ مسائل میں سمجھوتہ کی طرف سے نا امید نہیں ہوں، لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمان کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے اُن کا مقابلہ کرنا پڑے۔ اور ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصولِ مقاصد کے لئے تلی بیٹھی ہوں اور اپنے تمام عزائم کو ایک متحدہ نصب العین پر مرکوز کئے ہوئے ہوں۔"

صرف اتنا ہی نہیں کہا کہ راستہ کی مشکلات کی طرف ہی اشارہ کر دیا ہو بلکہ اس نبض شناس نے یہ بھی بتا دیا کہ قوم میں کس کس چیز کی کمی ہے۔ فرمایا:-

"میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ دورِ حاضرہ میں مسلمان دو مصیبتوں میں مبتلا ہیں پہلی مصیبت قحط الرجال کی ہے۔ سر سکیم ہیلی اور لارڈ ارون کی یہ تشخیص بالکل صحیح تھی کہ مسلم قوم میں رہنماؤں کا فقدان ہے جیسا کہ انھوں نے علیگڈھ یونیورسٹی کے طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ لیڈروں سے میری مراد ایسے حضرات ہیں جنھیں مبدأ فیض کی کرم گستری یا مشاہدات و تجربات کی بنا پر ایک طرف اسلام کی روح اور اس کے منتہائے نگاہ کے متعلق بصیرتِ تامہ حاصل ہو اور دوسری طرف عصرِ حاضرہ کے تاریخی شواہد بھی ان کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہوں۔ ایسے لوگ درحقیقت وہ زندہ قوتیں ہوتے ہیں جو قوم کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی پیدا کر دیتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اللہ کی دین ہوتے ہیں۔ جسے چاہے دے۔ حسب فرمائش بنوائے نہیں جا سکتے۔ دوسری مصیبت جو مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہے یہ ہے کہ ان کے دل سے احساسِ اجتماعیت فنا ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد اور چھوٹے چھوٹے فرقے الگ الگ راستوں پر

گامزن ہو رہے ہیں اور اُن کا کوئی کام ملت کے اجتماعی افکار و اعمال کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ہم آج میدانِ سیاست میں وہی کچھ کر رہے ہیں جو صدیوں تک مذہب کے دائرے میں کرتے رہے ہیں۔ لیکن فرقہ بندی کے فروعی جھگڑے ہماری اجتماعیت کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے۔ ان جھگڑوں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اصل اصول (مذہب) جو ہماری اجتماعیت کا نقطۂ ماسکہ ہے اس سے ہمیں گہری دلچسپی ہے۔ پھر یہ اصول اپنے اندر اتنی وسعت رکھتا ہے کہ کوئی گروہ یا فرقہ اس حد تک سرکش نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے کٹ جائے لیکن سیاسیات کے دائرے میں انتشار اور بالخصوص ایسے مواقع پر انتشار جب کہ قوم کی زندگی کا انحصار ہی اتحادِ عمل پر ہو قوم کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔

یہ تھا وہ نصب العین جو اس حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے ۱۹۳۰ء میں قوم کے سامنے رکھا۔ کہنے والے کا کام کہہ دینا تھا۔ بتا دینا تھا۔ لیکن اس ہنگامہ آرائی کے دور میں اس پر کون کان دھرتا۔ کسی نے اُسے شاعر کا تخیل کہا۔ کسی نے فلاسفر کا ناممکن العمل نظریہ بتایا۔ اور یوں صدائے جرسِ کارواں۔ خود کارواں کے شور و غوغا میں گم ہو کر رہ گئی۔

وقت گذرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے۔ موسم میں تبدیلیاں آئیں۔ آندھیاں رکیں۔ بگولے تھمے۔ بادل چھٹے۔ فضا میں قدرے سکون پیدا ہوا۔ لیکن یہ مردِ دانا اسی طرح خاموش، اپنے کمرے کے ایک گوشہ میں چارپائی پر لیٹے گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ آنے جانے والے اتنا محسوس کرتے کہ اُسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ اس کی متجسس نگاہیں ہر آنے والے کے چہرے کی طرف للچا کر اٹھتیں لیکن حسرت بن کر لوٹ جاتیں یوں ہی دن گذرتے گئے۔ کہ ایک دن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دیدہ ور کی نگاہوں میں چمک سی پیدا ہوئی ہے۔ اس کی پیشانی پر اطمینان کے آثار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے جس کی تلاش تھی وہ مل گیا۔

جو ڈھونڈھتا تھا وہ پالیا! یہ کون تھا؟ ایک حیثیت وزارۂ مُشتِ استخواں۔ بظاہر مغربی سانچوں میں ڈھلا ہوا پیکر۔ لوگوں میں ایک قانون دان کی حیثیت سے مشہور۔ اس مردِ خاموش نے اپنے پاس بُلایا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اور پھر کامل سکون و طمینان سے مسکراتے ہوئے یہاں سے چل دیا۔

اب یہ شمعِ کاروانِ ملّت ایک مُفکّر سے ایک مُدبّر کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ مفکّر کا کام سفر کی آخری حد یعنی منزل کا تعین تھا۔ مدبّر کا کام راستہ کی عملی مشکلات کا جائزہ لے کر قدم بقدم منزل کی طرف جادہ پیما ہونا تھا۔

دنیا اس مدبّر سے کافی عرصہ سے واقف تھی۔ لیکن انھوں نے دیکھا کہ اب اس میں غیر محسوس طور پر کچھ تبدیلی پیدا ہو رہی ہے اس نے سب سے پہلا نشانِ راہ یہ کہکر متعین کیا کہ مسلمانوں کی نمایندگی کا حق صرف اسلامی جماعت کو ہو سکتا ہے۔ مخلوط جماعت کو نہیں ہو سکتا۔ اس آواز پر ادھر اُدھر سے چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ غیر تو غیر، خود اپنوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ جب فضا میں ذرا سکون ہوا تو اس نے یہ کہکر اگلا نشان قائم کر دیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ اس پر ان چہ میگوئیوں نے ہنگامہ کی سی صورت اختیار کرلی۔ لیکن یہ صاحبِ تدبر و فراست بھی عجیب تھا کہ کسی کی چہ میگوئیاں اس پر اثر کر سکی تھیں نہ اب یہ غوغا آرائیاں۔ جوں جوں غیروں کی طرف سے شورش برپا ہوتی تھی۔ اپنے خود بخود سمٹ کر اس کے گرد و نواح جمع ہوتے جاتے تھے۔ ہنگامہ ذرا فرو ہوا تو اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اعلان کر دیا کہ مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں۔ اس پر تو بہت سوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس ہنگامے میں اور تیزی پیدا ہوگئی۔ اب کچھ کچھ اپنوں نے بھی سمجھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔

وہ مسلسل دو برس تک اس طرح غیر محسوس طور پر قدم بقدم آگے بڑھتا گیا۔ تاآنکہ ۱۹۴۰ء میں اس نے اس مردِ خاموش کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر ایک لاکھ کے مجمع میں اسی نصب العین کو دہرایا جس کا اعلان ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں ہوا تھا!

اعلان کیا تھا؟ گویا بھڑوں کے چھتے میں ڈھیلا دے مارا۔ چاروں طرف سے وہ شور و غوغا ہوا کہ

کو توبہ بھلی! لیکن سب سے بڑی حیرت یہ کہ اس طوفانِ مخالفت میں وہ بھی شریک جو اپنے آپ کو بڑے فخر و ناز سے "مسلمان" کہلائیں۔ مسلمان! اور مسلمانوں کی خوش بختی کی تجویز سے نالاں!! اسلام کے نام لیوا اور اسلام کی سرفرازی کے دشمن!! خدا کے بندے اور خدا کی حکومت کے قیام کی مخالفت!! بہرحال یہ مردِ ہوشمند۔ اپنی دھن کا پکا۔ نصب العین کی صداقت پر یقین۔ خدا پر بھروسہ۔ اپنوں اور بیگانوں کی مخالفت کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ مخالفوں کے اعتراض کا جواب دیتا۔ اپنوں کا اطمینان کراتا۔ مستانہ وار آگے بڑھتا گیا۔ دو برس اسی تگ و دو میں گذر گئے۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ مسلمانوں کے اس نصب العین کی کہیں سے بھی تائید نہیں ہو رہی اور شاید سیاسی حلقوں میں اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا رہا۔ تا آنکہ مارچ ۱۹۴۲ء کے آخری ہفتہ میں حکومت برطانیہ کے نمائندہ خصوصی کی طرف سے اس دستورِ اساسی کے بنیادی خطوط کا اعلان ہوا۔ جس کی رو سے جنگ کے بعد ہندوستان کے نظامِ حکومت کی تشکیل کی امید کی جاتی ہے۔ اعلان ہوا اور لوگوں نے حیرت کی نگاہ سے دیکھا کہ اس میں اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو علاقہ چاہے اپنا مرکز الگ قائم کر کے اپنی جداگانہ حکومت متشکل کرے۔

دستورِ اساسی کی ان تجاویز کو لے کر یہ سالارِ کاروانِ ملتِ اسلامیہ، رواں دواں۔ الٰہ آباد کی طرف روانہ ہوا اور بارہ برس پہلے جس سرزمین سے اس مفکرِ اسلام حکیم الامت نے مسلمانوں کے اس نصب العین کا اعلان کیا تھا اسی خطۂ زمین میں بیٹھکر اس نصب العین کے اصول کی فروعات پر غور و فکر کیا۔ حکومت کی یہ تجاویز مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہوں یا کسی تصریح۔ ترمیم و اضافہ کی محتاج، بہرحال حقیقت دنیا کے سامنے آگئی کہ وہ نصب العین جسے آج سے بارہ برس پیشتر محض ایک شاعر کی دنیائے تصورات اور ایک فلاسفر کا جہانِ تخیلات قرار دیا جاتا تھا اُسے ایک قابلِ عمل سیاسی اصول کی حیثیت سے تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوا۔

حالی مرحوم نے ملتِ اسلامیہ کے مرثیہ میں اس حقیقت کی طرف باچشمِ نم اشارہ کیا تھا کہ دینِ حجازی کا وہ بے باک بیڑہ جو نیل و فرات سے با صد شان و شوکت صحیح و سلامت گذر گیا

وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

لیکن قدرت کا کرشمہ ہے کہ گنگا اور جمنا کے جس سنگم میں وہ بیڑا ڈوبا تھا۔ اس کے دوبارہ ابھرنے کی امید بھی

اسی سنگم میں پیدا ہوئی ۔ حالیؒ نے وہ کہا تھا اور حکیم الامتؒ نے یہ کہ

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ طوفاں سے پار ہو گا

وہ بھی ٹھیک تھا۔ اسے بھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کے صدقے سچ کر دکھائے گا۔

سوداگر کی نگہِ دور رس

هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ؁
کیا تمھیں ایک ایسی تجارت کا نشان راہ بتاؤں جو تمھیں (غلامی کے) دردناک
عذاب سے نجات دلا دے! (پ ۲۸)

مُسلم لیگ کے اجلاس (الہ آباد) میں ایک رضا کار نے اپنی تلوار قائدِ اعظم کی خدمت میں پیش کی۔ مِلّت کے امین نے یہ تلوار قوم کے مال خانہ میں داخل کردی۔ وہاں سے اسے اربابِ نظر کی بیتابیِ شوق کی وجہ سے بازار بیع وشری میں لایا گیا۔ صلائے عام میں پانچ ہزار۔ دس ہزار۔ پندرہ ہزار۔ بیس ہزار۔ اکیس ہزار تک بولی بڑھی اور ٹھہر گئی۔ لیکن ایک گوشے میں ایک بہت بڑا سوداگر بیٹھا تھا۔ اس کی دور رس نگاہ نے بھانپ لیا کہ یہ متاعِ گراں بہا کتنی سستی جا رہی ہے۔ وہ اٹھا اور اُس نے دس ہزار بڑھا کر اکتیس ہزار میں تلوار خرید لی۔

حاجی سیٹھ سر عبد اللہ ہارون نے اپنی زندگی میں ہزاروں سودے کئے ہونگے لیکن یہ سودا ایسا ہے جس پر ہم اُن کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

جمادے چند دادی۔ جاں خریدی! تعالی اللہ عجب ارزاں خریدی!!

قرآن پہلے سے موجود ہے۔ تلوار اب ہاتھ میں آگئی۔ اب اور کیا چاہیئے۔

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

طلوعِ اسلام کا لٹریچر

(بحوالہ "لمعات")

حسب ذیل پمفلٹ دفتر میں موجود ہیں۔ ان کی اشاعت سے ہمارا بلند مقصد بھی عام ہوگا اور موجودہ نامساعد حالات میں ادارہ سے تعاون کی شکل بھی پیدا ہو جائے گی۔

اسلامی معاشرت ۔ مسلمان کی زندگی ۔ سوراجی اسلام ۔ راشٹر پتی ابوالکلام آزاد
شخصیت پرستی ۔ علم حدیث ۔ جہانِ نو یعنی پاکستانی اسکیم قرآن کریم کی روشنی میں
اسلام اور مذہبی رواداری ۔ واردھا کی تعلیمی اسکیم اور مسلمان ۔ زبان کا مسئلہ
متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد ۔ خدا کی بادشاہت
شاہ ولی اللہ اور قرآن و حدیث

محصول ڈاک علاوہ (پورے سٹ پر محصول ڈاک بصیغہ رجسٹری ۹ر لگتا ہے)

طلوعِ اسلام مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت سے آج تک کے تمام پرچے بہ استثنائے ذیل موجود ہیں۔ فی پرچہ چار آنہ۔ محصول ۱ر کے حساب سے منگائیے۔

جون، جولائی، اگست	۳۸ء
جنوری	۳۹ء
مارچ	۴۰ء

ناظم
ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

اسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

از جناب پرویز صاحب

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے لیکن فادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے مسلمانوں کی روزمرّہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے اس کی عادات و اخلاق کا خاکہ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اس کے تمدّن و معاشرت کے خط و خال اس کی تعلیم و تہذیب اس کے دنیاوی معاملات اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلقات غرض کہ اسکی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے اور اس قدر سادہ اور دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا۔ بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہے بچوں کے لئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کر لیا جائے تو طلباء کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے۔

قیمت ۴ر محصول ۱ر

ادارۂ طلوعِ اسلام دہلی

لمعات

اشاعتِ حاضرہ سے طلوعِ اسلام کی زندگی کے چار سال پورے ہو جاتے ہیں یوں تو قوموں کی زندگی میں چار سال کا عرصہ آنکھ جھپکنے سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن جس برق رفتاری سے آجکل دنیا میں انقلابات رونما ہو رہے ہیں۔ اور جن تبدیلیوں کی آماجگاہ خود ہمارا ملک بن رہا ہے۔ ان کے پیشِ نظر چار سال کا قلیل سا عرصہ بھی ناقابلِ اعتنا نہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں مسلمانانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ کی ابتدا ہوئی یہی وہ عرصہ ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظریاتِ زندگی کا بنیادی اور اصولی فرق نمایاں طور پر دنیا کے سامنے آیا۔ اسی دور میں مسلمانانِ ہند کی جدوجہد کا درخشندہ نصب العین عزم کی صورت میں متعین کیا گیا پھر اسی زمانہ میں موجودہ عالمگیر جنگ کی ابتدا ہوئی جس میں چشمِ فلک نے بڑی بڑی سلطنتوں کو مٹتے اور حکومتوں کو اجڑتے دیکھا۔ بہت سے تاجدار خانماں خراب ہو گئے۔ بڑی بڑی عظیم الشان بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں رفیع المنزلت عمارتیں کھنڈرات ہو گئیں سینکڑوں میدان انسانوں کے خون سے لالہ زار بن گئے امیدوں کی ہزاروں کھیتوں کو آگ کی شعلہ باریوں نے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ تباہی۔ بربادی۔ بھوک۔ موت کے خوفناک عفریت۔ انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے چاروں طرف سے آگ اور خون کی ہولی کھیلتے لپک پڑے بغرضیکہ اس مختصر سے عرصہ میں دنیا جن انقلابات کی اسٹیج بنی۔ شاید گذشتہ ہزار برس میں بھی ایسے انقلابات سطحِ ارض پر نمودار نہ ہوئے ہوں۔ یہ تھا وہ چہار سالہ دور جس سے گذر کر طلوعِ اسلام آج اپنی چوتھی منزل تک پہنچا ہے۔

طلوعِ اسلام (دورِ جدید) کا پہلا پرچہ حکیم الامت حضرت علامہ اقبال (علیہ الرحمۃ) کی مقدس آرزوؤں کی روشنی میں ۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا۔ اور فطرت کی ستم ظریفی کہ اس کے گیارہ روز بعد حضرت علامہ عالمِ جاودانی کی طرف تشریف لے گئے اور اس طرح طلوعِ اسلام ان کی "سرپرستی" کے بجائے ان کی "یادگار" میں تبدیل ہو گیا۔ ان کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا لیکن ان کا پیغام اسی آب و تاب کے ساتھ ہماری

راہ نمائی کے لئے موجود تھا۔ یہ پیغام کچھ اپنی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ درحقیقت خدائے لم یزل کے آخری پیغام ہی کی تفسیر ہے۔ اس لئے ہماری راہ نمائی کے لئے اللہ کی اس کتاب زندہ کی روشنی موجود تھی اور یہ وہ روشنی ہے جو اپنی موجودگی میں کسی انسان کی عدم موجودگی کا زیاں محسوس نہیں ہونے دیتی۔

طلوع اسلام کے سامنے مقصد کیا تھا! اس کی تصریح کے لئے طلوع اسلام کا سب سے پہلا پرچہ سامنے لائیے۔ مقصد واضح ہو جائے گا! اس مقصد کے سمجھنے کے لئے ذرا آج سے چار سال پیشتر کے حالات پر چھلتی سی نگاہ ڈالئے۔ پھر معلوم ہوگا کہ طلوع اسلام کن حالات میں شائع ہوا اور اس کی اشاعت سے غرض وغایت کیا تھی۔ ہندوستان میں مسلمان بہ حیثیت **مسلمان** تو بہت پہلے سے ختم ہو چکا تھا (ہمارا مقصد "کفر اور اسلام" کے امتیاز سے نہیں بلکہ انفرادی (یعنی عجمی) اور اجتماعی (یعنی اسلامی) زندگی سے ہے) لیکن مخالف قوتوں کی آتش حسد وانتقام اس سے بھی فرو نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے ایک منظم سازش کر رکھی تھی کہ جس حیثیت میں مسلمان یہاں موجود ہے اس کی وہ حیثیت بھی (خاکم بدہن) ختم کر دی جائے اور اسے اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا جائے کہ من وتو کا جھگڑا ہی مٹ جائے اس گہری سازش کو بروئے کار لانے کے لئے بڑے بڑے نظر فریب پرنے لٹکائے اور دام ہمرنگ زمین بچھائے گئے تھے۔ یہ کچھ غیروں کی طرف سے ہو رہا تھا لیکن اس سے مہیب تر مصیبت یہ تھی کہ بہت سے مسلمان۔ کچھ اپنے اغراض کے ماتحت کچھ سادہ لوحی کی بنا پر غیروں کے دامِ فریب میں جکڑے جا چکے تھے۔ ان سب میں قابل افسوس طبقہ علمائے کرام کا تھا اور یہی وہ طبقہ تھا جو سب سے زیادہ نقصان کا موجب تھا۔ اس لئے کہ عوام پر علماء کا بڑا اثر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ایک عالم کی لغزش سب سے بڑی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔

لہٰذا طلوع اسلام کے سامنے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ مسلمان جس حیثیت میں بھی ہندوستان میں موجود ہیں۔ ان کے تحفظ وبقا کے لئے کوشش کرنا اور دوسرے یہ کہ انھیں صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے راستہ کی طرف لیجانا۔

سرِ شق اول اس لئے اہم تھی کہ جب ہندوستان میں (خدانکردہ) مسلمان ہی باقی نہ رہے تو پھر اصلاح کس کی کیجائے گی! جب آب وگل ہی باقی نہ رہے گا تو پیکر کس چیز کا بنے گا اور روح کس میں پھونکی جائے گی۔

اور شق دوم اس سے بھی اہم تھی کہ مسلمان کے لئے حقیقی زندگی تو **مسلمان** ہی کی زندگی ہے۔ اور یہ زندگی اس اجتماعیت کے بغیر ناممکن ہے جس کا مرکز حکومت الٰہیہ ہو۔ اس کے لئے رجعت الی القرآن

شرطِ اولین ہے۔

شقِ اول کے لئے مسلمانوں کی ٹوٹی پھوٹی جماعت (مسلم لیگ) کی از سرِ نو تشکیل شروع ہو چکی تھی اس لئے طلوعِ اسلام نے اپنے مقصدِ پیشِ نظر کے حصول کی خاطر۔ اس جماعت کی تائید و حمایت کو اپنا فریضہ سمجھا۔ لیکن اندھی تائید و حمایت کو نہیں۔ اس لئے کہ اس کے سامنے شقِ اول کے ساتھ ساتھ شقِ دوم بھی تھی۔ اس لئے اس نے مسلم لیگ کے ہر ایک قدم کو اپنی نگاہوں سے پرکھا اور قرآن کی روشنی میں جانچا۔ اور تائید حق و صداقت کی۔ کی طلوعِ اسلام کا مسلم لیگ کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ تعلق نہیں تھا۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ مسلم لیگ کے مدِمقابل (بدقسمتی سے) علمائے کرام کی جماعت تھی جو متحدہ قومیت کے نظر فریب و جاذبِ نگاہ دام کا شکار ہو چکی تھی۔ علمائے کرام کے پاس عوام پر اثر اندازی کے لئے مذہب کا نام سب سے مؤثر ذریعہ تھا۔ اتفاق سے مسلم لیگ کے اربابِ بست و کشاد (بالعموم) اس راہ سے زیادہ واقف نہ تھے۔ طلوعِ اسلام کا مدار ہی کتاب و سنت پر تھا اس لئے مسلم لیگ کے نصب العین کی حقانیت کی تائید میں قال اللہ اور قال الرسول کی سند پیش کرنے کی سعادت مبدأ فیض کی طرف سے اس کی پیشانی پر خطوط میں لکھی تھی۔ طلوعِ اسلام نے اس خدمت کو کس انداز سے سرانجام دیا۔ اس کے متعلق اپنی طرف سے کچھ کہنا خود ستائی ہوگی۔ اس چار برس کے تغیرِ حالات اس کی زندہ شہادت ہیں۔ اور اصل شہادت تو اللہ کی میزان میں ہی مل سکتی ہے جو صرف حرکات و سکنات ہی کو نہیں تولتی بلکہ نیت اور ارادہ کو بھی پرکھتی ہے۔ کسی اور کی نگاہ میں اس خدمت کی جو قیمت ہو سو ہو۔ ہماری تو یہ حالت ہے کہ جب اپنی ان ناچیز مساعئ ناتمام کے اثرات و نتائج پر نگاہ جاتی ہے تو جبینِ ناز اس بارگاہِ صمدیت کے آستانۂ عالیہ پر جھک جھک کر سجدے کرتی ہے۔ یقیناً نتائج ہماری مساعی سے کہیں بڑھ کر اور اثرات ہماری جد و جہد سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور یہ سوائے اس ربِ ذو المنن کی رحمت اور نوازش کے اور کیسے ہو سکتا تھا! جی چاہتا ہے کہ بطورِ تحدیثِ نعمت قطع کردہ منزل کے چند ایک نشاناتِ راہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔

(۱) جون ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں "سوراجی اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا گیا جس میں بہ صراحت بتایا گیا کہ مسلمان نیشنلسٹ حضرات کے نزدیک اسلام کا مفہوم مسلکِ قومیت پرستی سے پہلے اور بعد میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون اس قدر مقبول اور اثر انداز ہوا کہ اسے جداگانہ پمفلٹ کی صورت میں شائع کرنا پڑا۔ اس وقت تک اس کی مانگ برابر چلی آ رہی ہے۔

(۲) جولائی ۱۹۳۸ء میں جب کانگریسی حلقوں سے مسلم لیگ کے ساتھ مصالحت کی سلسلہ جنبانی ہو رہی تھی۔ گفتگوئے مصالحت کے عنوان سے ایک لمبا مقالہ شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں صلح کس بنیادی اصولوں پر ہو سکتی ہے۔ اس کا بھی الگ پمفلٹ شائع ہوا۔ اور دوسرے ایڈیشن میں اس کا عنوان مسلم لیگ کا بنیادی مطالبہ رکھا گیا۔

(۳) اگست ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں "دار دہا کی تعلیمی اسکیم" کے متعلق وہ معرکۃ الآرا مضمون شائع ہوا جس نے ہندوستانی سیاست میں فی الواقعہ ایک نشانِ راہ کا کام دیا۔ یہ رسوائے عالم اسکیم درحقیقت ایک گہری لیکن خاموش سازش تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو یکسر اسلام سے بیگانہ بنا دیا جائے۔ الحمد للہ ذالک کہ اس کے خلاف پہلی اور مؤثر آواز اٹھانے کی سعادت طلوع اسلام کو نصیب ہوئی مضمون کی اہمیت، مقبولیت اور اثر اندازی کا اس سے اندازہ فرمائیے کہ اس کا ترجمہ ملک کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں ہوا۔ متعدد رسائل و جرائد نے اسے نقل کیا۔ اور صرف اردو میں اس کے بیس ہزار کے قریب پمفلٹ شائع ہوئے اسوقت تک اس کی طلب بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس ایک پمفلٹ سے (بتوفیق ایزدی) دار دہا اسکیم کے داضعین کے منصوبے خواب پریشاں بن کے رہ گئے۔ یہ اللہ کا احسان ہے اور اس کی رحمت

(۴) اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون بعنوان "زبان کا مسئلہ" شائع ہوا جس میں اس سازش کا انکشاف کیا گیا جس کی رو سے اردو کے بجائے "ہندی اتھوا ہندوستانی" کو رائج کر کے مسلمانوں کو ان کی متاعِ علمی کی وراثت سے محروم کئے جانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس موضوع پر اس پمفلٹ نے حرفِ آخر کا کام دیا (فالحمد للہ علی ذالک)

(۵) جنوری ۱۹۳۹ء میں "متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا جس سے اس غیر اسلامی نظریہ کی تردید کی گئی کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں" اس پمفلٹ میں قومیت کے بنیادی اصول، مسلم اور غیر مسلم قومیت کے تصورات کا فرق۔ کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی قومیت کی تشکیل اور نصوص صریحہ سے جناب مدنی کے عجمی نظریہ کا بطلان اس انداز سے کیا گیا کہ اس کا جواب نہیں بن پڑا۔

(۶) مارچ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں جمعیۃ العلماء کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو حضرات علماء کرام کی خدمت میں ایک کھلی عرضداشت بھیجی گئی جس میں بدلائل و براہین بتایا گیا کہ اسلامی مرکزیت کو چھوڑ کر قومیت پر

کا مسلک کس طرح اسلام کی رُوح کے منافی ہے۔ اس مضمون کا بھی الگ پمفلٹ شائع کیا گیا۔

اسی اشاعت میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے ۱۹۳۰ء کے مشہور خطبۂ صدارت کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا جس میں اصل خطبہ کی روح نہایت آب و تاب سے جھلک رہی تھی۔

(۷) جون ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب (حیدر آبادی) کی منطقوں کی تقسیم کی مشہور اسکیم شائع کی گئی۔ اس کا بھی الگ پمفلٹ شائع ہوا۔

(۸) جولائی ۱۹۳۹ء میں "سوشلزم اور اسلام" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ حقیقی سوشلزم کیا ہے اور دورِ حاضرہ کا سوشلزم اسلام سے کیا نسبت رکھتا ہے۔ الگ پمفلٹ کی صورت میں بھی چھاپا گیا۔

(۹) اگست ۱۹۳۹ء میں "کفار سے دوستی" کے عنوان سے ایک جامع مضمون شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی صحیح نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔

(۱۰) ستمبر ۱۹۳۹ء میں "کانگریس بے نقاب" کے عنوان سے ایک حقائق پرور مضمون شائع ہوا جس میں کانگریس کے چہرے سے نظر فریب نقاب اتار کر اس کے اصل خط و خال دیدۂ بینا کے سامنے پیش کئے گئے۔ الگ پمفلٹ بھی شائع ہوا۔

(۱۱) دسمبر ۱۹۳۹ء میں "اسلام اور جمہوریت" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مغربی انداز جمہوریت کس طرح اسلامی تعلیم کے خلاف ہے اور حقیقی جمہوریت کیا ہے۔

(۱۲) جنوری ۱۹۴۰ء میں ہندی سیاست میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے فی الواقعہ جناب جناح کے حسنِ تدبر کی دھاک بٹھادی۔ طلوع اسلام نے اس اہم موقعہ پر "یوم نجات" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع کیا جس میں واضح کیا کہ اس دن "کی اہمیت کیا ہے۔

اس اشاعت میں نیشنلسٹ علماء کے مسلک پر قرآنی روشنی میں مزید تنقید کی گئی۔

(۱۳) ابتدائے ۱۹۴۰ء میں "کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی" کا عام چرچا تھا جو کانگریسی بساط سیاست کا ایک خطرناک مہرہ تھا۔ فروری ۱۹۴۰ء میں اس مہرے کی چالوں کو بے نقاب کیا گیا۔

(۱۴) مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس (لاہور) منعقد ہوا جس میں پاکستان کے نصب العین کا ریزولیوشن پاس ہوا۔ طلوع اسلام نے اس تقریب پر اسلامی سیاست کے مختلف

گوشوں پر قرآنی روشنی میں تبصرہ کیا اور بتایا کہ پاکستان کیا ہے!

(۱۵) جناب ابوالکلام صاحب آزاد ایک عرصہ کی طویل خاموشی کے بعد۔ کانگریس کے سالانہ اجلاس کے خطبۂ صدارت میں لب کشا ہوئے تھے۔ اپریل ۱۹۴۰ء میں راشٹریتی کے عنوان سے خطبۂ صدارت پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا۔ یہ الگ پمفلٹ کی صورت میں بھی طبع ہوا۔

(۱۶) جون ۱۹۴۰ء میں "جہانِ نو" کے عنوان سے وہ حقیقت کشا مقالہ شائع ہوا جس میں نظریۂ پاکستان کی تشریح و تفصیل اور مخالفین کے اعتراضات اور ان کے جواب واضح طور پر پیش کئے گئے پاکستان کے متعلق یہ مقالہ فی الواقعہ قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پمفلٹ بیحد مقبول ہوا۔ اور ابھی تک اسکی مقبولیت کی رفتار بدستور جاری ہے۔

(۱۷) فروری ۱۹۴۱ء میں "قیاس کن تو کجائی و اکجا واعظ" کے عنوان سے ایک مرتبہ پھر قومیت پرست حضرات کے مسلک کا تجزیہ کر کے ان کی غلطی کو ان پر واضح کیا گیا ہے۔

(۱۸) ستمبر ۱۹۴۱ء میں "تحریف فکریہ" کے عنوان سے مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا گیا۔ اور ان کا مستقبل جن ہولناک مصائب سے پٹا پڑا ہے۔ ان سے متنبہ کیا گیا۔

(۱۹) جنوری ۱۹۴۲ء میں "دنیا کی نجات" کے عنوان پر ایک حقیقت افروز مقالہ میں مسٹر آرتھر مور (ایڈیٹر اسٹیٹسمین) کے ایک مضمون کے جواب میں بتایا گیا کہ دنیا کی حقیقی نجات کس انداز زندگی میں ہے

(۲۰) فروری ۱۹۴۲ء میں رازِ حیات کے عنوان سے اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کا راز کس طرح نظم و اطاعت میں مضمر ہے۔

اپریل ۱۹۴۲ء کا پرچہ آپ کے سامنے ہے۔

یہ وہ ابھرے ہوئے عنوانات ہیں جو اس وقت سامنے آگئے۔ ان کے علاوہ متعدد دیگر مضامین انہی حقائق کو لئے ہوئے زینت دہِ اوراق ہوئے۔ ان کے علاوہ طلوع اسلام کے "حقائق و عبر" اور "لمعات" درحقیقت گذشتہ چہار سالہ ہندی (اور اسلامی) سیاست کی زندہ تاریخ ہیں۔ جس قدر واقعات و حوادث مہینہ بھر میں سامنے آتے رہے۔ ان پر بے لاگ تنقید اور بے لوث تبصرہ۔ ان عنوانات کے ماتحت آجاتا تھا۔ اگر ان دو عنوانوں کو اکٹھا کر کے الگ شائع کر دیا جائے تو ہمارے اس انقلابی دور کی بصیرت افروز تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے

نشر و اشاعت کی وسعت داماں کا اندازہ اس سے فرمائیے کہ ساٹھ ہزار کے قریب پمفلٹ اس وقت تک شائع کئے جا چکے ہیں۔

یہ سب کچھ اس قادرِ مطلق کی ذرہ نوازیوں کے صدقے ہوا جس کی توفیق کے بغیر نہ ذہن میں کوئی خیال وارد ہو سکتا ہے۔ نہ قلب میں جلا پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی قلم میں حرکت آفرین جنبش آ سکتی ہے۔

یہ شق اول تھی۔ شق دوم (یعنی دعوت الی القرآن) پہلی شق سے کہیں زیادہ مشکل اور نازک تر تھی۔ اس لئے کہ شق اول میں غلط روش کے نتائج و عواقب محسوس شکل میں سامنے آجاتے تھے اور اس طرح صحیح راستہ کی اہمیت جلدی سمجھ میں آسکتی تھی۔ لیکن شق دوم میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کا تعلق عقائد سے تھا۔ اور عقائد۔ خواہ کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوں۔ انسان کی ایسی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں کہ انھیں آسانی سے چھڑایا نہیں جا سکتا ذرا غور فرمائیے کہ مسلمان کتنے طویل عرصہ سے قرآن سے بیگانہ ہو کر غیر قرآنی نظریاتِ زندگی کو عین اسلام سمجھے ہوئے ہے۔ ان تمام غیر قرآنی معتقدات کو چھوڑ کر قرآن کریم کی صحیح راہ پر گامزن ہونا۔ جوئے شیر کا لانا ہے۔ یہ تمام مشکلات ہمارے سامنے تھیں اور ہم نے ہر ایک مشکل کا اندازہ لگا کر اس وادی میں قدم رکھا تھا اپنے مسلک کی صداقت پر غیر متزلزل یقین اور اللہ کی نصرت و توفیق پر محکم بھروسہ ہمیشہ ہمارا زادِ راہ اور سامانِ سفر۔ انہی کے بل بوتے پر ہم جادہ پیما ہوئے اور آج چار سال کی طے کردہ منزل پر جب ہم نگہ بازگشت ڈالتے ہیں تو ہماری ناتواں گردن اس محسن حقیقی کے بار احسان سے جھک جاتی ہے۔ یہ اس کا فضل ہے جسے وہ عطا فرما دے۔ اس باب میں حسب ذیل مقالات ایسے ہیں جو نمایاں طور پر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) مئی ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی کا اہم مضمون بہ عنوان "فہم قرآن" شائع ہوا اور جون ۱۹۳۸ء میں اس کی دوسری کڑی "اصول قرآن" کے عنوان سے طبع ہوئی۔ ان ہر دو مضامین نے اذہان کو دعوت غور و فکر دی اور قلوب کی دنیا میں ان سے ایک امید افزا حرکت پیدا ہوئی۔

(۲) جولائی ۱۹۳۸ء کے پرچہ میں جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز کا مقالہ بہ عنوان "جماعتی زندگی" شائع ہوا۔ جو اس سلسلہ زریں کی پہلی کڑی تھی جس سے مسلمانوں کی انتشار و افتراق کی زندگی کی جگہ مرکزیت و اجتماعیت کی زندگی کی طرف قدم اٹھانا مقصود تھا۔

(۳) اکتوبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں علامہ اسلم صاحب کا مضمون "اسلامی نظام" شائع ہوا جس نے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول

کے قرآنی مفہوم کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کیا۔

(۴) نومبر ۱۹۳۸ء میں جناب پرویز کا ایک مبسوط مضمون بہ عنوان "مرکزیت" شائع ہوا جس میں اسلامی نظام کے نقطہ اسکہ کی تشریح کی گئی۔

(۵) فروری ۱۹۳۹ء میں علامہ سلم صاحب کا مضمون بہ عنوان "اسباب زوال امت" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ ملت اسلامیہ قرآن کریم سے الگ ہو کر کن کن مصائب و نوائب کا شکار ہوئی ہے۔ اور اس کی بازآفرینی کی صورت کیا ہے!

(۶) اپریل ۱۹۳۹ء میں علامہ سلم صاحب کا مضمون "علم تفسیر" شائع ہوا جس میں قرآنی تفاسیر پر ایک ناقدانہ تبصرہ کیا گیا اور بتایا گیا تھا کہ قرآن کریم کی صحیح تفسیر کس طرح ہو سکتی ہے۔

(۵) مئی ۱۹۳۹ء میں جناب پرویز کا مقالہ "خدا کی بادشاہت" شائع ہوا جس نے حکومت الٰہیہ کے بنیادی خط و خال کو نمایاں طور پر واضح کر دیا اور یوں بتایا کہ انسان کی بادشاہت اور خدا کی بادشاہت میں کیا فرق ہے اس کا پمفلٹ آج تک مقبولیت عامہ کا آئینہ دار ہے۔

(۶) اس سے اگلے ماہ جناب پرویز کا اس سلسلہ کا دوسرا مضمون "اسلام اور مذہبی رواداری" شائع ہوا۔ جس میں تاریخی شواہد سے بتایا گیا تھا کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے کس قسم کا عدل و انصاف اور احسان و فیاضی کا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس کا بھی الگ پمفلٹ شائع کیا گیا۔

(۷) ستمبر ۱۹۳۹ء میں علامہ سلم صاحب کا مضمون "نادر شاہ اور اتحاد شیعہ و سنی" شائع ہوا جس میں تاریخ کی روشنی میں بتایا گیا تھا کہ مسلمان ایک مرکز کے قیام تک کے درمیانی دور میں اپنے اپنے جزئی اختلافات کے باوجود کس طرح اصولی اتحاد کر سکتے ہیں۔

(۸) اکتوبر ۱۹۳۹ء میں جناب پرویز کا معرکتہ الآرا مضمون "مسلمان کی زندگی" شائع ہوا۔ متن خود عنوان سے ظاہر ہے یعنی مسلمان کی زندگی کیا ہونی چاہیئے اس کا پمفلٹ بھی متعدد بار چھپ چکا ہے۔

(۹) جنوری ۱۹۴۰ء میں جناب پرویز کا مضمون "تمسک بالکتاب" شائع ہوا ہے جس میں قرآن کی طرف رجعت کی دعوت نہایت دلنشین انداز میں دی گئی۔

(۱۰) مارچ ۱۹۴۰ء میں انہی کا مشہور مضمون "شخصیت پرستی" شائع ہوا جس میں شرح و بسط سے بتایا گیا کہ مذہب میں خدا۔ رسولؐ۔ ائمہ۔ علماء۔ مشائخ۔ وغیرہ کی صحیح صحیح پوزیشن کیا ہے۔ اس پمفلٹ نے فی الواقعہ قلوب

کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

(۱۱) مئی ۱۹۴۰ء میں علامہ سلیم صاحب کا بصیرت افروز مضمون علم حدیث شائع ہوا۔ جسے صحیح تاریخی تنقید کا شاہکار کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس مضمون نے علمی دنیا میں تموج پیدا کر دیا۔ اس کا الگ پمفلٹ بھی شائع کیا گیا۔

(۱۲) اگست ۱۹۴۰ء میں شاہزادہ سعید علیم پاشا مرحوم کا مشہور مضمون "حکومت الٰہیہ" شائع ہوا۔

(۱۳) اسی ماہ جناب پرویز کا مضمون "ختم نبوت" شائع ہوا جس میں اس اہم مسئلہ کو ایک جدید اور خالص قرآنی روشنی میں پیش کیا گیا۔

(۱۴) مارچ ۱۹۴۱ء میں پرویز صاحب کا مضمون "سائنس اور اسلام" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں سائنس میں کیا کیا معرکۃ الآرا کارنامے سرانجام دئے۔

(۱۵) اپریل ۱۹۴۱ء میں انہی کا ایک اور مضمون "فردوس گم گشتہ" شائع ہوا جس میں انھوں نے ملت اسلامیہ کی بازآفرینی کی قرآنی شکل پر اپنے مخصوص دلکش و جاذب توجہ انداز میں بحث کی۔

(۱۶) مئی ۱۹۴۱ء میں "نظام جدید" کے عنوان سے ایک اہم مقالہ شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ دنیا کو جس نظام نو کی تلاش ہے وہ اسلام کے باہر اور کہیں نہیں مل سکتا۔

(۱۷) اگست ۱۹۴۱ء میں جناب پرویز کا مضمون "کیا تمام مذاہب یکساں ہیں" شائع ہوا۔ اس مضمون نے دنیائے مذاہب کو صحیح صراط مستقیم کی طرف دعوت غور و فکر دی اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا۔

(۱۸) اکتوبر ۱۹۴۱ء میں جناب پرویز کا ایک اور حقیقت کشا مضمون "نجات" کا قرآنی نظریہ شائع ہوا۔ اور دسمبر ۱۹۴۱ء میں اس کا تکملہ۔ بعنوان "نظریہ ارتقا" ان ہر دو مضامین نے موجودہ زندگی اور حیات اخروی کے متعلق قرآنی نظریہ کی نہایت مبصرانہ انداز میں وضاحت کر دی اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں پیدا ہونے والے بہت سے شکوک کا ازالہ کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب پرویز کے مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر شے کو قرآن کی روشنی میں پیش کرتے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے شکوک و شبہات کی تسکین قرآن ہی کے چشمۂ سلسبیل سے اس انداز سے کرتے جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ عدم یقین کی آگ ایمان کی طمانیت میں بدل جاتی ہے۔

یہ شق دوم کے چیدہ چیدہ عنوانات ہیں۔ ان کے علاوہ شمس العلماء سید محب الحق صاحب کے محققانہ بصیرت افروز مقالات اور جناب اشفاق احمد خاں صاحب کے "سلسلہ اصلاح" میں قرآنی مقالات اس

سلسلہ کی دوسری کڑیاں ہیں۔ علاوہ بریں سلیم کے نام خطوط" کا دلنشین اور دل میں اتر جانے والا سلسلہ اس دور کی بہترین یادگار قرار دیا جاسکتا ہے۔

پھر حصۂ نظم میں جناب اسد ملتانی کی نوازش ہائے پیہم نے خانۂ اقبال کی مہبائے نور و بصیرت کے وہ چھلکتے ہوئے ساغر دئے کہ جن کی لذت نگاہوں کی دنیا میں بسنے والوں کے سوا کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔

یہ سب کچھ محض اللہ کے فضل و کرم کے تصدق ہوا۔ ورنہ ہمارے بس میں کہاں تھا کہ اتنی سی قلیل مدت میں معارف و حقائق کا ایسا گراں بہا مجموعہ قارئین طلوع اسلام تک پہنچا سکتے جی چاہتا ہے کہ ان حضرات کی خدمت میں دل ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کیا جائے جن کی نظر التفات نے طلوع اسلام کے دامن کو گہرہائے نایاب سے بھر دیا لیکن پھر یہ سوچکر اس کی جرأت نہیں پڑتی کہ ان حضرات نے کچھ ایسا قلبی یگانگت کا رشتہ پیدا کر رکھا ہے جس کے پیش نظر اتنی سی رسم" بھی بیگانگی کی غماز معلوم ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ دل کی باتیں دل ہی کی زبان سے کر لیجائیں۔ الفاظ اس کی ترجمانی سے شرمندہ نہ کریں۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

ان سب سے بلند و بالا اور سب سے بڑی سعادت جو ادارۂ طلوع اسلام کے حصہ میں آئی وہ جناب پرویز کی نادر روزگار تالیف "معارف القرآن" کی اشاعت تھی۔ اس سعادت پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ یہ بھی اللہ کے ان احسانات میں سے ہے جن کا شکریہ ادا نہیں کیا جاسکتا۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری ان معروضات کو خودستائی پر محمول نہیں کیا جائیگا۔ کہ یہ خودستائی نہیں بلکہ بارگاہ صمدیت میں تشکر و امتنان کے اظہار کی والہانہ تمنا ہے۔ اس تحدیث نعمت کو خودستائی تصور نہ کیجئے کہ ستائش و نیائش سب اسی ذات بے ہمتا کو زیبا ہے جس کے آستانۂ عالیہ کے ہم سب بھکاری ہیں۔ گداگر کی جھولی میں اگر موتیوں کی مالا ہے تو اس کا حقیقی فخر اس متاع گراں بہا کے بخشندہ کے لئے ہے نہ کہ گداگر کے لئے

اس تمام حرف شیریں کے ساتھ ساتھ ایک تلخ حقیقت بھی۔ شومئی قسمت کہ ہماری اس تمام تگ و دو میں مولوی حضرات کا طبقہ جسے نہ صرف ہمارے ساتھ ساتھ بلکہ پیش پیش ہونا چاہیئے تھا بطور مدّ مقابل سامنے آگیا۔

شق اوّل میں اس لئے کہ قوم کی بدبختی سے موجودہ سیاسی کشمکش میں ان حضرات نے (بالعموم) متحدہ قومیت کا غیر اسلامی مسلک اختیار کر لیا اور ان کے دعاوی کا کتاب وسنت کی روشنی میں بطلان۔ طلوع اسلام کے مقدر میں لکھا گیا۔ اور شق دوم میں اس لئے کہ قرآن کی تعلیم کی طرف دعوت کئی ایک ایسے غیر اسلامی نظریات زندگی کے خلاف جاتی تھی جو ایک عرصہ سے مسلمانوں میں پختہ عقائد کی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور جن کے اجارہ دار ہمارے یہ مولوی صاحبان تھے۔ لہٰذا ان حضرات کی طرف سے طلوع اسلام کی مخالفت ضروری تھی۔ اگر یہ حضرات دلائل وبراہین سے اپنے مسلک کی حقانیت اور طلوع اسلام کے پیش کردہ نظریات کی مخالفت کرتے تو ہمیں اس سے خوشی ہوتی۔ لیکن افسوس کہ ان حضرات نے اپنی مخصوص روش کو اس مقام پر بھی نہ چھوڑا۔ اور دلائل اور براہین کی بجائے "سیاسی اور مذہبی گالیوں" پر اتر آئے۔ شق اول میں انگریز پرست۔ ٹوڈی۔ حکومت کے کاسہ لیس۔ برطانیہ کے پٹھو۔ اور اسی قسم کی گالیاں۔ اور شق دوم میں ملحد۔ بے دین۔ گمراہ۔ نیچری۔ منکر حدیث۔ چکڑالوی اور خدا جانے کیا کیا نام رکھے۔ اور یوں اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہزار ہزار احسان اس دلوں کی کائنات کے مالک کا جس نے ہمارے دامن کو راستہ کی ان خاردار جھاڑیوں میں الجھنے سے محفوظ رکھا۔ اور جوں جوں راستہ کا یہ ہنگامہ بڑھتا تھا۔ چراغ منزل روشن سے روشن تر ہو کر ہمارے قریب آتا گیا اور اس کی جاذبیت نے ہمیں فرصت ہی نہ دی کہ ہم ان ہنگامہ خیزیوں میں جذب ہو کر رہ جائیں۔ ان مقامات سے صحیح وسالم گذار کر لے جانا۔ توفیق ایزدی کے سوا اور کس کے بس میں تھا۔

بہرحال یہ ہے مختصر سی روئداد اس راستہ کی جسے طے کر لینے کے بعد ہم آج بتوفیق ایزدی اپنی چوتھی منزل تک پہنچ رہے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ نامساعد حالات ایسے نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں کہ ان کے اثر سے محفوظ رہنا ناممکن ہے۔ ان حالات کی وجہ سے پیدا شدہ مشکلات کا ضمنی تذکرہ اس سے پیشتر ان صفحات پر آتا رہا ہے ان مشکلات کا روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور صورت حالات کے بہتر ہونے کی ابھی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔ اس ضمن میں آپ حضرات سے اتنے سے تعاون کی درخواست ہے کہ طلوع اسلام کا شائع کردہ لٹریچر (جس کی تفصیل الگ دی جا رہی ہے) خرید فرما کر اس کی عام اشاعت کریں۔ اس کے علاوہ ایک درخواست اور بھی ہے۔ طلوع اسلام نے اپنی اس چہار سالہ زندگی میں کبھی ناغہ نہیں کیا۔ لیکن چار سال کے مسلسل سفر کے بعد جی چاہتا ہے کہ ایک ماہ کی آپ سے رخصت مانگ لیجائے۔ چار سال میں ایک مہینہ کی

رخصت کا حق تو ملنا ہی چاہیئے۔ گذشتہ چند ماہ سے کاغذ کی کمیابی اور گرانی کی وجہ سے طلوع اسلام کی ضخامت ۱۶ صفحات کی کر دی گئی ہے۔ لیکن موجودہ پرچہ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اس لئے اگر ہم اسے۔ ایک ماہ کی رخصت کی بنا پر۔ اپریل اور مئی کا مشترکہ پرچہ قرار دیں لیں تو ہمیں امید ہے کہ قارئین اپنی کشادہ نگہی سے کام لیتے ہوئے ہمیں اس کی اجازت دیدیں گے۔ لہٰذا مئی کا پرچہ الگ شائع نہیں ہوگا۔ ہم اس غیر حاضری کو خود بھی محسوس کرتے ہیں اور ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ قارئین اسے کس طرح محسوس کریں گے۔ اس کے لئے ہم اپنے احباب سے معذرت خواہ ہیں۔

اپریل ۱۹۴۳ء کا مہینہ بھی ہندوستان کی تاریخ سیاست میں یادگار رہیگا۔ جن لوگوں کی نگاہیں رفتار زمانہ اور انگلیاں نبض اقوام پر رہتی ہیں انھوں نے برطانیہ کے ایوان حکومت کے پردوں کی جنبش سے بھانپا کہ ہندی سیاست کے مسئلہ میں ایک نیا دور آنے والا ہے چنانچہ اس کے بعد فضا میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ حکومت برطانیہ کے ارباب بست و کشاد مسئلہ ہند کی پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کی فکر میں منہمک ہیں۔ ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر ہندوستان میں ہندو راج کے منصوبے گانٹھنے والوں کے دل طلسم پیچ و تاب بن رہے تھے۔ انھوں نے وقت کی نزاکت اور مسئلہ کی اہمیت کا خوب احساس کیا اور سمجھ لیا کہ بساط سیاست پر آخری چالیں چلنے کا زمانہ آپہنچا ہے چنانچہ انھوں نے اپنے مخصوص "کاریانہ" انداز میں آوازیں دیں اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ادھر ادھر سے سدھے ہوئے پرندے پھڑ پھڑاتے باہر نکل آئے۔ دہلی میں غلاموں کے غلام یعنی آزاد مسلم کانفرنس کے بورڈ کا جلسہ ہوا۔ یہ وہی کانفرنس ہے جسے دو برس ادھر تجویز پاکستان کی مخالفت کی غرض سے دہلی میں جمع کیا گیا تھا اور جس کا اس کے بعد کہیں نام تک بھی سننے میں نہ آیا تھا۔ چنانچہ یہ حضرات دہلی کے کسی گمنام گوشے میں جمع ہوئے اور آپس میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ہندوستان کی نوٹری بڑی جماعتوں کے نمائندہ ہیں۔ اور ہندوؤں کے اخبارات نے بڑے بڑے جلی حروف سے اعلان کر دیا کہ

"آزاد مسلم کانفرنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں کی کثیر جماعتیں مسلم لیگ کے روڑا اٹکانے والے رویہ کو پسند نہیں کرتیں (ہندوستان ٹائمز ۳/۴۲)

جب یہ تماشا یہاں دکھایا جا چکا تو یہ کمپنی "لاہور چلی گئی اور انہی ایکٹروں" سے وہاں "نئی سین سینری" سے اور ڈرامے اسٹیج کئے گئے۔ وہاں کانگریس کے (SHOW BOY) جناب راشٹرپتی صاحب بھی اپنی اداکاری

کے لئے تشریف فرما تھے۔ وہاں ان حضرات نے پنجاب کے وزیر اعظم مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن رکین۔ جناب سر سکندر حیات خاں سے بھی گفت و شنید کی اور کچھ وقت کے لئے اخبارات میں یہ خبر گشت لگاتی رہی کہ جناب سر سکندر مسلم لیگ اور کانگریس میں باہمی مصالحت کی سعی فرما رہے ہیں۔ دو فریقوں میں ایک تیسرے فریق (ثالث) کی وساطت سے مصالحت کے تذکرے تو دنیا نے عام سنے تھے۔ لیکن مصالحت کی یہ انوکھی کوشش لاہور ہی کے حصہ میں آئی کہ ایک جماعت (مسلم لیگ) کا ذمہ دار رکن۔ اپنی جماعت اور فریق مقابل میں صلح کی کوشش کر رہا ہے! مصالحت و مفاہمت کی یہ مساعی جمیلہ اس تذبذب کی بری طرح غمازی کر رہی تھیں جس کی رو سے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ حکومت برطانیہ کی تجاویز کی رو سے ملک کی قوت کانگریس کے قبضہ میں منتقل ہونے والی ہے یا لیگ اور کانگریس دونوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ پھر لاہور کے تماشے کے بعد کہیں سے انصار (یعنی جماعت مومنین) کے خود ساختہ "نمائندوں" کو تلاش کیا گیا اور ان سے اعلان کرایا گیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں ہے۔ غرضیکہ جہاں کہیں سے کوئی غدار ملت ملا۔ ڈھونڈھ کر نکالا گیا اور اس سے کہا گیا کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

غرضیکہ چاروں طرف سے چیخ و پکار کی وہ بھیانک آوازیں بلند کرائی گئیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تار پر تار۔ اعلان پر اعلان۔ ریزولیشن پر ریزولیشن۔ گلے مسلمانوں کے۔ ڈھنڈورا ہندو کا۔ سات سمندر پار ایک طوفان برپا کر دیا کہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ نہیں ہے۔

اس تمام خلفشار میں۔ خدا کا ایک نحیف و نزار بندہ۔ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا اور نہایت حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف تک رہا تھا کہ اے اللہ! یہ سب مسلمانوں جیسا نام رکھانے والے یہ جہاد عظیم کس بات کے لئے کر رہے ہیں! اس بات کے لئے کہ کہیں ہندوستان کے کسی گوشہ میں خدا کا نام لینے والوں کو آزادی کا سانس لینا نصیب نہ ہو جائے۔ اس غرض کے لئے کہ کہیں خدا کی زمین پر پھر سے خدا کی حکومت قائم نہ ہو جائے۔ اللہ اکبر!

آسماں راحق بود گر خوں ببارد برزمیں۔

۲۳ مارچ کو حکومت برطانیہ کا پیغام بر خصوصی۔ سر اسٹیفورڈ کرپس۔ حکومت برطانیہ کی تجاویز کی دستاویز

لیکر نئی دہلی پہنچ گیا۔ حساس قلوب سینوں میں دھک دھک کر رہے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ میں ایسا نازک دن کبھی نہیں آیا تھا۔ ہندوؤں کی سازش۔ ان کی تنظیم۔ دولت۔ قوت۔ باہمی اتحاد۔ نصب العین کی وحدت مرکزیت۔ پریس۔ اسٹیج۔ پراپیگنڈا۔ انگریز کو مرعوب کر دینے کے تمام حربے ایک طرف اور نشست۔ افتراق غداری۔ منافقت۔ خودغرضی۔ لامرکزیت۔ اطاعت۔ بے سروسامانی۔ بے زبانی۔ دوسری طرف لیکن ان تمام نامساعد حالات کے طوفانوں میں ایک کمزور و ناتواں ملاح۔ ٹوٹے پھوٹے تختوں کو جوڑ کر۔ نصب العین کی صداقت اور خدا کے بھروسہ پر روشنی کے بلند و محکم مینار کی طرح قائم کہ دنیا بھر کی مخالفت کی موجوں کے تھپیڑے آئیں اور اس کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہ کر سکیں۔ ایوانِ قصرِ ابیض کا یہ نامور پیغام بر آیا اور اسی شام جامع مسجد کے میناروں کے سائے۔ شاہجہاں کے لال قلعہ کی دیواروں کے سامنے اللہ کے نام کی بلندی اور مسلمانوں کی لٹی ہوئی شوکت کی یاد دلاتے ہوئے ملت اسلامیہ کے واحد نمائندہ قائد اعظم محمد علی جناح نے جن الفاظ میں اس مؤقر پیغام بر کا استقبال کیا ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ میں قیامت تک کے لئے ثبت کئے جانے کے قابل ہیں وہ جناح جس سے دنیا مقنن و مدبر کی حیثیت سے ہی متعارف ہے۔ اس شام آہنی عزم کے قالب میں تڑپنے والی بجلیوں کا پیکر نظر آتا تھا۔ افسوس کہ اپنے پریس کی کمی کی وجہ سے بیرونی دنیا کے لئے نہ تو اس جلسہ کی روئداد ہی صحیح طور پر سامنے آسکی اور نہ ہی جناب جناح کی پوری تقریر ہی کہیں محفوظ ہوئی۔ ہندو پریس کی تنگ نظری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ کم از کم پچاس ہزار کے بے پناہ مجمع کو صرف تین ہزار بتایا گیا۔ اور تقریر کی یہ کیفیت کہ ہر اخبار نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے مختلف طریق پر اسے مسخ شدہ صورت میں شائع کیا۔ بہرحال سننے والوں نے سنا اور جاننے والوں نے جانا کہ اس شام مسلمانوں کے اس خداداد قائد اعظم نے کس حسن و خوبی سے مسلمانوں کے بیتاب قلوب کے جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کی۔

سر کرپس نے مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو دعوتِ نمایندگی دی اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور بھان متی کے پٹارے کا سارا کھیل خواب پریشاں ہوگیا جب سر کرپس نے مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے مسلمانوں کے حقیقی نمائندہ جناب جناح ہی کو مجاز تسلیم کیا۔ یہ سب سے پہلی کامیابی تھی جو جناب جناح کے حسن تدبر اور خلوص و ایثار کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ لیکن آنے والا مؤرخ جہاں ایک طرف

اس دلکش حقیقت کو دیکھئے گا اس کے ساتھ ہی دوسری طرف اس کے سامنے یہ تصویر بھی آئے گی کہ مسلمانوں کے خلاف۔ غیر مسلموں کی نمائندگی کے لئے بھی ایک "مسلمان" ہی بھیجا گیا۔ يٰلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۔ اس "نمائندہ" سے مقصد کیا تھا؟ اس کا جواب خود غیروں کی زبان سے سنیئے۔

"سر کرپس کے ساتھ موجودہ گفتگوئے مفاہمت میں کانگریس کی طرف سے ایک مسلمان "روحانی پیشوا" کی نمائندگی۔ اس شور و غوغا کی کھلی ہوئی تکذیب کے لئے کافی ہوگی (جو مسلمانوں کی طرف سے) یہ ظاہر کرنے کے لئے کیا جاتا ہے کہ کانگریس مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کی سازش میں شریک ہے" (ہندوستان ٹائمز ۲۷ ۳/۴۲)

یعنی اس مسلمان "روحانی پیشوا" کو آگے بڑھانے سے مقصد یہ ہے کہ یہ ہندوؤں کی طرف سے صفائی کی شہادت پیش کرے تاکہ انہیں مسلمانوں کے خلاف ڈگری مل جائے! سچ کہا ہے ترجمانِ حقیقت نے کہ ([illegible] مرحوم)

اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است — جبینِ خود منہ جز بر درِ او!
سریں راہم بہ چوبش دہ کہ آخر! — حقے دارد بہ خرِ پالان گر او!

پریس کے نمائندوں نے لکھا ہے کہ جب جناب ابوالکلام آزاد سر کرپس سے مل کر باہر آئے ہیں تو ان کے چہرے پر سخت افسردگی چھا رہی تھی! ہمیں جناب آزاد کی اس حالت پر اس قدر ترس آیا کہ کہا نہیں جا سکتا ہمارے نزدیک ان مسلم قومیت پرستوں کے گروہ میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت جناب آزاد کی ہے۔ ایسا حساس قلب اور اس قدر بے پناہ مجبوریاں! اگر سینہ حق و باطل کی کشمکش سے اضطراب و کاوش کے جہنم کے شعلوں کی آماجگاہ نہ بن جائے تو اور کیا ہو! پریس کے نمائندوں کو ان کے چہرے کی افسردگی پر حیرت ہوئی۔ لیکن اس میں حیرت کا ہے کی! ضمیر کی مار کچھ کم جانکاہ نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے ان کے چہرے سے افسردگی کی وجہ معلوم کرنے کے لئے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت ہی نہ تھی۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ دل کی پریشانی کے حال ماتھے پر لکھے مل جاتے ہیں۔ سر کرپس کی تجاویز میں اس اصول کو بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ جو صوبے چاہیں اپنا مرکز جداگانہ قائم کرلیں۔ اس اصول کی روشنی میں مسلمان اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی جداگانہ حکومت کا امکان نظر آتا تھا۔ دوسری طرف خداوندان کانگریس کا ارشاد تھا کہ اور سب کچھ مانا جا سکتا ہے لیکن ہندو راج سے مسلمانوں کی نجات کا اصول نہیں مانا

جاسکتا۔ پھر مسٹر کرپس نے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو تسلیم کر لیا اور ارباب کانگریس سب سے زیادہ اسی حق نمائندگی کے خلاف تھے۔ کہئے! اس کشمکش میں اگر جناب آزاد کے چہرے کی ہوائیاں نہ اڑیں۔ تو اور کیا ہوتا! لہٰذہ جب وہ کمرے سے باہر نکلے ہیں تو کمرے کے اندر کی گذری ہوئی داستان ایک ایک خط و خال سے عیاں تھی۔

بیہ اُڑی اُڑی سی رنگت۔ یہ کھلے کھلے سے گیسو   تیری صبح کہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ

حکومت برطانیہ کی تجاویز سامنے آچکی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب تک ان اصولوں کی عملی تشریحات کھلے کھلے الفاظ میں طے نہ ہو جائیں جن میں مسلمانوں کو من حیث القوم اپنا جداگانہ مرکز حکومت قائم کرنے کا حق دیا جائے۔ اس وقت تک یہ تجاویز مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتیں لیکن اس اصول کا تسلیم کر لینا بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا عام مسلمان میدان سیاست میں بہت پیچھے ہے۔ اس لئے اس کے لئے ابھی اس قسم کی آئینی تبدیلیوں کے اثرات کا صحیح صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو ذرا غیر مسلموں کے تاثرات کو جانچئے۔ یہ اصول جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ہمارے نزدیک کچھ بھی نہیں تاوقتیکہ اس کی عملی تشکیل کی جزئیات طے نہ پا جائیں لیکن ذرا مخالفین کے شور و غوغا کو دیکھئے کہ انھوں نے اس کے خلاف کس طرح آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ اصول علیحدگی کے خلاف اس قدر کہرام کیوں مچایا جا رہا ہے! اس کے لئے کہنے کو تو قومیت پرستوں کی طرف سے عجیب عجیب دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غم و غصہ اور شور و شین کی خلفشار میں سچی بات بے اختیار منہ سے نکل جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۲۷ مارچ کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے۔

> "علاوہ بریں۔ یہ حقیقت کہ مسلمانوں کی اکثریت کے دونوں علاقے ہمارے ملک کے شمال مغربی اور شمال مشرقی دروں کو روکے ہوئے ہونگے باقی ملک کی حفاظت کے مسئلہ کو ناممکن بنا دیں گے۔ اس لئے کہ جو لوگ علیحدگی کے خواہاں ہیں وہ اس حقیقت کا کھلا کھلا اعلان کرتے ہیں کہ ان کے قلبی رجحانات۔ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے مقابلہ میں سرحد پار کے لوگوں کی طرف زیادہ ہیں"۔

غور فرمایا آپ نے کہ علیحدگی کے نظریہ کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے کیوں ہو رہی ہے؟

بہرحال۔ اس اصول کے تسلیم کئے جانے سے اور کچھ ہو یا نہ ہو۔ کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ پاکستان کا نصب العین اور زیادہ نمایاں حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے آگیا اور اس پختگی سے عوام کے دلوں میں گھر کر گیا کہ اب اگر (بفرض محال) لیگ بھی اس نصب العین سے ہٹ جائے تو بھی مسلم عوام اس سے کبھی نہیں ہٹ سکتے۔ اب اس نصب العین کو دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کے دل سے نہیں نکال سکتی۔ سچ کہا تھا حکیم الامت نے کہ پاکستان مسلمانوں کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ فی الواقعہ یہ "ارضِ مقدس" مسلمانوں کے حصہ میں لکھی جا چکی ہے اب یہ مسلمانوں کے اپنے بس میں ہے کہ اسے جلدی حاصل کر لیں یا قوم بنی اسرائیل کی طرح چالیس سال کی دشت پیمائیوں کے بعد حاصل کریں۔ بہرحال یہ زمین ان کے نام لکھی جا چکی ہے۔ اب کام کرنے کا وقت آیا ہے۔ اور وہ کام کیا ہے؟ کوئی لمبی چوڑی قربانی نہیں۔ صرف اتنا کہ پاکستان کا چرچا عام کر دیا جائے مسلم اکثریت کے صوبوں کے ایک ایک گوشے میں کونے کونے میں۔ گاؤں گاؤں۔ قریہ بہ قریہ۔ شہر بہ شہر۔ ہر جگہ ہر مقام پر اس کا چرچا کیا جائے۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جناب قائداعظم نے جس فنڈ کی اپیل کی ہے اس میں کروڑوں روپے جمع کر دئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اللہ کی اس نعمت کی ابھی تک قدر نہیں پہچانی جو اس نے جناب جناح کی ذات میں انھیں عطا کر دی ہے۔ اس لئے نہیں پہچانی کہ یہ نعمت انھیں بالکل مفت ہاتھ آگئی ہے۔ ذرا آج سے چار برس ادھر اپنی حالت پر غور کیجئے۔ گورنمنٹ اور کانگریس ملک میں دو ہی جماعتوں کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا۔ یعنی ۹/۱۰ کروڑ کی ملت اسلامیہ کا وجود ہی کوئی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اور آج چار برس میں حالت یہ ہے کہ ملک میں کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی کہ کوئی ایسا نظام مسلط کر دیا جائے جو مسلمانوں کے نزدیک قابل قبول نہ ہو؟ ذرا سوچئے کہ ہم کس مقام سے کس مقام تک پہنچ گئے! اور یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ نہ کہیں ایک قطرہ خون بہایا گیا۔ نہ قیدیں کاٹی گئیں۔ نہ جیل خانے بھرے گئے۔ نہ پولیس کی سختیاں برداشت ہوئیں۔ نہ بھوکے مرے۔ نہ پیاسے رہے حتکہ پیسہ تک بھی نہ دیا۔ اور سب کچھ مفت میں ہو گیا! لیکن مفت میں نہیں ہوا۔ قدرت کی فیض گستری سے ملت اسلامیہ کو ایسا وکیل مل گیا جس کے دل میں شوکت اسلامی کے احیاء کا عشق پیدا ہو گیا! اور یہ سب کچھ اس کے حسن تدبر اور سوز عشق سے ہو گیا! لیکن اب وقت وہ آگیا ہے کہ اس مردِ راہ بیں کے ہاتھوں کو مضبوط بنا دیا جائے۔ مسلمانو! اگر تم نے ایسا کر دیا تو بغیر ایک قطرہ خون بہائے۔ حکومت تمہاری اپنی ہو جائے گی۔ شاید دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہو کہ حکومت جیسی

متاعِ گراں بہا ایسی سستی مل جائے! افسوس ہے ان پر جو اس پر بھی اسے نہ خرید سکیں۔

پھر ضرورت ہے اس امر کی کہ اب مسلم لیگ اپنی پوری توجہات مسلم اکثریت کے صوبوں (بالخصوص پنجاب اور بنگال) پر مرتکز کر دے۔ کہ سب سے بڑا خطرہ یہیں پوشیدہ ہے۔ بنگال اور پنجاب کا مسلمان اس مقدس نصب العین کی خاطر سب کچھ کر ڈالے گا بشرطیکہ اس سے کام لینے والے مخلص ہوں!

ہمیں خوشی ہوئی کہ مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس میں دو اہم ریزولیشن پاس کئے۔ ایک کی رُو سے جناب جناح کو کامل اختیارات تفویض کئے گئے کہ وہ موجودہ مفاہمت کے سلسلہ میں ملّت اسلامیہ کے لئے جو کچھ مناسب خیال فرمائیں کریں۔ فی الواقعہ جناب جناح نے اپنی بے لوث قربانیوں سے ثابت کر دیا ہے کہ قوم بلا خوف و خطر اپنا مستقبل (بتوفیق ایزدی) ان کے ہاتھوں میں سونپ سکتی ہے۔ دوسرے ریزولیشن میں حکومت سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ خاکساروں اور علامہ مشرقی پر عائد کردہ پابندیوں کو اٹھالے۔ خدا کرے کہ اس میں کامیابی ہو جائے۔ ہم اس مقام پر ایک مرتبہ پھر اس گذارش کو دہرانا چاہتے ہیں کہ علامہ مشرقی کو چاہیئے کہ وہ مسلم لیگ کے عسکری بازو کی حیثیت سے اس مرکزی جماعت کے ساتھ شامل ہو جائیں اور خاکساروں کی جماعت کو مسلم نیشنل گارڈ کی شکل میں تبدیل کر دیں۔ مقصد جب مسلمانوں کی شوکت اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے تو اس میں من اور تو کا کیا سوال؟ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

وقت کی نزاکت کے اعتبار سے سب سے اہم تجویز وہ ہے جس کی رُو سے مستقبل کے خطرات سے مسلمانوں کی جان و مال اور عزّت۔ آبرُو کے تحفظ کے لئے مختلف صوبوں میں حفاظتی کمیٹیاں متعین کرنے کا فیصلہ ہوا مسلم لیگ کا بنیادی مقصد مسلمانوں کا تحفظ ہے۔ اور ایسے وقت میں جبکہ آنے والے خطرات کی خوفناک گھٹائیں چاروں طرف سے منڈلاتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں۔ یہ فریضہ اہم ترین حیثیت اختیار کر لیتا ہے ہم جیسا کہ متعدد بار لکھ چکے ہیں اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اس کے ہاں کسی کو ناحق نقصان پہنچانا کسی صورت میں بھی روا نہیں۔ اس لئے کسی شریف انسان کو مسلمانوں سے کسی قسم کے خطرے کا بھی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اپنی حفاظت کی فکر سے بے اعتنائی برتنا۔ یہ تو خودکشی کے مرادف ہے۔

اس لئے اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان نہایت سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں اور اپنے اپنے مقامی حالات کے مطابق اپنی حفاظت کی عملی تدابیر اختیار کریں۔ اگر ہمیں جرأت عرض سے معاف کیا جائے تو ہم مؤدبانہ گذارش کریں گے کہ اس معاملہ کو محض ریزولیشن کی حد تک ہی نہ رہنے دیا جائے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ چند علاقوں کے علاوہ لیگ کے ارباب حل محض ریزولیشن پر ہی اکتفا کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے ہم مرکزی لیگ سے خاص طور پر درخواست کریں گے کہ وہ اس مسئلہ کو خود اپنے ہاتھ میں لے اور حفاظتی تدابیر کا پورا پورا بندوبست کرے۔ اگر اس غرض کے لئے الگ روپیہ کی ضرورت ہو تو اس کا فوری اعلان کیا جائے۔ سب سے اہم سوال نیشنل گارڈ کی ترتیب تنظیم کا ہے۔ اس طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو لیگ کے مرکز سے وابستہ کرلیں اور کارکنان لیگ کو چاہیئے کہ اس نازک وقت میں اپنے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کریں۔ واللہ المستعان

اشاعت زیر نظر میں عمداً تاخیر کر دی گئی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ سر کرپس کی تجاویز کے متعلق آخری فیصلہ کا انتظار تھا۔ اور دوسرے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی بنا پر۔ سر کرپس کی تجاویز کے متعلق تو ابھی تک کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ ان سطور کی تحریر (یعنی ۱۰ اپریل کی شام) تک یہ مسئلہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے زیر بحث ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ ہے بھی اس قدر اہم اور نازک کہ اس کے فیصلہ میں ذرا سی غفلت یا جلد بازی نہ معلوم قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دے۔ اس لئے ۲۷ مارچ سے اس وقت تک اس پر کامل غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ فیصلہ کچھ بھی ہو۔ معاملہ بڑا دشوار گذار سامنے ہے۔ اگر ان ضروری تفاصیل کے حسب منشا طے ہو جانے کے بعد جن کی تشریح کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ان تجاویز کو قابل قبول سمجھ لیا گیا تو جنگ کے دوران میں اندرونی ضبط و نظم اور بیرونی حرب و ضرب کی ذمہ داری ایسی اہم ہے جس کے لئے فولادی کندھوں کی ضرورت ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے قوم کے ہر فرد کے بہترین تعاون کی ضرورت ہوگی۔ اور اگر لیگ کے مطالبات منظور نہ کئے گئے تو پھر قوم کے ذمے جو اہم فرائض عائد ہونگے۔ ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا صورت کچھ بھی ہو۔ اب سہل انگاری کا وقت ختم ہو گیا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ نہ بھی سامنے آتا تو بھی جنگ کے شعلوں کی لپک کے پیش نظر قوم کے تحفظ کا سوال ہی اتنا اہم ہے کہ اس کے لئے باتوں کو چھوڑ کر کچھ کر کے دکھانا ضروری ہو چکا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالٰی ہمارے دلوں میں راسخ عزائم۔ خون میں صحیح حرارت اور بازوؤں میں صالح قوت عطا فرمائے تاکہ دنیا کے امن کے ضامن اور انسانیت کی حفاظت کے کفیل۔ کم از کم اپنے تحفظ کا سامان تو کر سکیں۔

باقی رہا لیگ کا جلسہ۔ سو اس کے متعلق جو روداد اس وقت تک سامنے آئی ہے وہ بلا شبہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ مسلم عوام میں اب بیداری اور جوش پیدا ہو چکا ہے اور وہ اپنے قائد کے حکم کے ماتحت اپنے ملی نصب العین کے حصول کے لئے سچی تڑپ رکھتے ہیں۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ ہمارے قومیت پرست حضرات (بالخصوص علمائے کرام) پاکستان کے خلاف ہمیشہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ اس سے اقلیت کے صوبوں کے مسلمان بیکسی و کس مپرسی کے عالم میں رہ جائیں گے۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ پاکستان کی حمایت سب سے زیادہ شدومد سے اقلیت ہی کے صوبوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ لاہور میں جب پاکستان کا ریزولیشن پیش ہوا تو اقلیت کے صوبوں کے اسلامی نمائندوں میں سے ایک ایک نے آگے بڑھ کر انتہائی خلوص اور جوش سے اس کی تائید کی اور اب اس ریزولیشن کی عملی تشکیل کے زمانہ میں لیگ کا اجلاس خود اقلیت کے صوبہ میں ہوا۔ ہم اس ملی جشن کے تمام کارپردازان کی خدمت میں ان کی قابلِ رشک کامیابی پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں

آخر میں ایک مرتبہ پھر دہرا لیجئے کہ آپ نے کرنا کیا ہے۔

(۱) قائد اعظم کی اپیل کے جواب میں جو کچھ زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ ۱۰ اورنگ زیب روڈ۔ نئی دہلی کے پتہ پر جلد از جلد بھیج دیجئے (۲) مسلم لیگ کی تجویز کے مطابق مسلمانوں کے تحفظ کی خاطر مقامی کمیٹیاں مرتب کیجئے اور ان میں عملی حصہ لیجئے (۳) نیشنل گارڈ کی تشکیل میں پوری جدوجہد کیجئے۔

(۴) مرکزی لیگ کو اتنا مضبوط بنا دیجئے کہ وہ اکثریت کے صوبوں (بالخصوص پنجاب اور بنگال) پر اپنی پوری پوری توجہات مرکوز کر سکے۔ (۵) اور یہ یاد رکھئے کہ

(ا) طلوع اسلام کا مئی کا پرچہ الگ شائع نہیں ہوگا۔

(ب) اور یہ کہ معارف القرآن کے مجلد نسخے بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد مجلد کتاب شاید ہی مل سکے۔

رسٹرڈ ایل نمبر 4240

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) طلوع اسلام ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۵ تاریخ سے پہلے پہلے آنی چاہیئے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہو جاتا ہے اس مہینے کے پرچہ کے اندر ایک اطلاعی جوابی کارڈ رکھ دیا جاتا ہے جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آنا چاہیئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے۔ قیمت فی پرچہ ۸/ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔پی طلب کرنے کے بعد اسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھیئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمائیے۔

(۹) آپ اپنا تعارف نمبر خریداری کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بیحد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) طلوع اسلام کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لئے اس سے اشتراک عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ واللہ المستعان

(۱۳) نمونے کے پرچہ کے لئے ۴ر کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

(۱۴) تازہ پرچہ ۸ر

ناظم ادارۂ طلوع اسلام دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Toolo-i-Islam Office Delhi.